دائرۃ المعارف

یعنی

معارف، اعظم گڈہ

کی

سترہوین جلد

از

جنوری سنہ ۱۹۲۶ء تا جون سنہ ۱۹۲۶ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

باہتمام مسعود علی ندوی

مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈہ

سیرۃ النبی ﷺ

رسول اللہ صلعم کے حالات، غزوات، اور اخلاق و عادات کے متعلق بہت سے رطب و یابس واقعات تاریخ و سیر کی کتابون مین مذکور ہین، لیکن اس کتاب کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین اس قسم کی تمام روایتون سے قطع نظر کر لیگئی ہی، اور صرف وہ واقعات بیان کئے گئے ہین جو قرآن مجید اور احادیث مین مذکور ہین، اور جنکی صحت مین کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہین، تاریخ و سیر سے بھی وہی واقعات لئے گئے ہین جنکی صحت پر عقلی و نقلی حیثیت سے کوئی اعتراض واقع نہ ہو،

اب تک اس کتاب کے تین حصے شائع ہو چکے ہین، اور تین حصے اور باقی ہین، پہلے حصے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات ہین اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمین سیرت کی کتابون پر تنقید کیگئی ہی اور انکی خصوصیات بتائی گئی ہین اسی مقدمہ مین آپکی سوانح کے متعلق اور بھی چند اہم اور اصولی مباحث مذکور ہین، دوسرے حصہ مین آپکی وفات، آپکے اخلاق و عادات، اور اعمال و عبادات وغیرہ کا مفصل بیان ہے، اور یہ حصہ تمامتر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے،

تیسرے حصے مین آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہی اس مین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہی،

قیمت باختلاف کاغذ

حصہ اول تقطیع خورد، سے ۱للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان، عہ، حصہ دویم تقطیع خورد ۱ہ ہے
حصہ سویم تقطیع کلان، عہ ہے

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ،

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ہفدہم جنوری سنہ ۱۹۲۶ء تا جون سنہ ۱۹۲۶ء

بہ ترتیب حروف تہجی،

فہرست مضامین

جلد ہفدہم جنوری سنہ ۱۹۲۶ء جون سنہ ۱۹۲۶ء

فرنگی محل کی آخری شمع بجھ گئی!

آہ! مولٰنا عبد الباری!!

وما کان قیس هلکه هلک واحد

قیس کا مرنا صرف ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے،

ولکنه بنیان قوم تهدما

بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گرجانا ہے

دریغا! کہ آج قلم کو اُس مجسمۂ علم و اخلاص کا ماتم کرنا ہے جس کے وصف و مدح کا فرض اسکو بارہا ادا کرنا پڑا ہے، دار العلم و العمل فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل و کمال، اخلاق و ایمان، اور زہد و ورع کی جو آخری شمع جل رہی تھی وہ ۱۹-۲۰ کی درمیانی شب میں ہمیشہ کے لیے بجھ گئی،

فرنگی محل کے متاخرین میں حضرت استاذ الاساتذی مولانا عبد الحئیؒ کے بعد مولانا عبد الباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایات کی حامل تھی، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف، ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین و ملت کی راہ میں ان کا جانفروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہمرنگِ شہدا تھا،

ذاتی اخلاق، جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی، ان کے اوصاف گرانمایہ تھے، وہ بیکسوں کے ملجا، مسافروں کے ماوی، اور تنگدستوں کے دستگیر تھے، عبادت گذار شب زندہ دار اور حق کے طلبگار تھے، ہندوستان میں اونکی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت

سے اس وقت فرد تھی، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا یقیناً انھیں کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اسلیے اونکی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں، بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، اور بنا بریں اونکی جوانامرگی ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا،

شمع بجھ گئی، مگر اوس کے دھوئیں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر یہ ہمیشہ لکھا نظر آئے گا،

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مولانا مرحوم کا سن غالباً ۴۵ کے قریب ہوگا، مولانا عبدالحئی صاحب کے شاگرد خاص مولانا عین القضاۃ صاحب سے لکھنؤ میں تحصیل کی، پھر حجاز گئے، وہاں حدیث کی سند لی، ملک شام کا سفر کیا، علما سے فیض اٹھایا، مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس آئے، اور خدام کعبہ میں پرجوش شرکت کی، پھر مجلس خلافت اور جمعیۃ العلما کی تاسیس میں حصہ لیا، ترک موالات کے علمبردار بنے،

دوسری طرف فرنگی محل میں مدرسۂ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسۂ عربیہ کی بنیاد ڈالی اور اسکو ایک باقاعدہ مدرسہ بنایا جس سے متعدد اصحاب فکر اور اہل قلم طلبہ پیدا ہوئے،

انھوں نے اپنے بعد اپنی تالیفات و تصنیفات کی فہرست یادگار چھوڑی ہے، وہ فقہ حنفی کے پرجوش حامی تھے، اور اونکی قلمی و علمی کوششیں زیادہ تر اسی کے متعلق صرف ہوتی رہیں، اون کی چھوٹی بڑی تصنیفات و رسائل کی فہرست ۱۰۰ کے قریب ہوگی جنمیں سب سے زیادہ مفید کار آمد ان کی اردو تفسیر تھی جو افسوس کہ ناتمام رہی، امام محمد کی سیر کبیر کا کام بھی ان کے پیش نظر تھا، علم حدیث میں بھی ان کے ایک دو رسالے ہیں،

افسوس کہ یہ چشمۂ فیض اب ہمیشہ کے لیے خشک ہوگیا،

انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

مجلد ہفدہم | ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۲۶ء | عدد اول

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

کانگریس میں پانچ چھ برسوں سے جو انقلاب پیدا ہو گیا ہے وہ مخفی نہیں، کانگریس اب خوشنما لباسوں، گداگرانہ تجویزوں، اور فصاحت و بلاغت کی نمایشوں سے خالی ہو گئی ہے، اب وہ صرف کام کرنے والوں کی جماعت بنگئی ہے، اس کا تخاطب اب حکومت سے نہیں، ملک سے ہے، اس کو اب آزادی کا مطالبہ گورنمنٹ سے نہیں بلکہ خود قوم سے ہے، سال کے اختتامی ہفتہ میں کانپور اور علی گڈہ کے ہنگامے یادگار رہیں گے، مسلمانوں کی شرکت نے اوسکی ہمتوں کو بڑھا دیا ہے،

ہم سال بھر تک ہندو مسلم بگاڑ کے افسانے بہت سنتے رہے، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوں کی ایک تعداد مسلمانوں ہی سے لڑنا ہندوستان کی آزادی سمجھتی ہے اور ان کا اکھاڑا ہندو مہا سبھا ہے لیکن کانپور کی کانگریس نے یہ بات ثابت کردی کہ ابھی تک سمجھدار ہندو مسلمانوں کی تعداد ملک میں کافی موجود ہے، مالوی جی اور پنڈت موتی لال نہرو کی تجویز و ترمیم بظاہر ایک خاص تحریک سے متعلق تھی، مگر درحقیقت وہ محض تجویز و ترمیم کی جنگ نہ تھی، بلکہ دو مقابل کے نظامِ کار اور طرزِ عمل کی لڑائی تھی، جسمیں مالوی جی کو شکست فاش ملی،

امسال کی کانگریس کے متعلق یہ شکایت بجا ہے کہ اوس کے اعلانات اور سائن بورڈوں اور کتبوں

میں اردو کو جگہ نہیں دیگئی تھی جسکی وجہ سے ہندی نہ جاننے والوں کو دقتیں پیش آتی رہیں، تاہم اسکی داد دینی چاہیئے کہ صدر استقبالی نے اپنا پورا خطبہ صاف ستھری اردو میں پڑھا، کانگریس کی صدر محترمہ نے بھی اپنی آدھی تقریر اردو ہی میں کی، اور آدھی انگریزی میں اور اپنی لکھی ہوئی تقریر اردو اور انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں چھپوا کر تقسیم کی، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر اکابر نے اردو ہی میں تقریریں کیں،

خلافت کا اجلاس کانپور گو تزک و احتشام سے خالی تھا، مگر تین چیزیں بالکل صاف اور کھلی تھیں، یہاں عزت و احترام کا مدار جیب کی گرانی اور دنیاوی اعزاز پر نہ تھا، کام پر تھا، تمام مہمانوں میں سلوک اور برتاؤ کی یکسانی اور مساوات کار فرما تھی، دوسری چیز یہ تھی کہ یہ محض خوش پوش بات بنانے والے لوگوں کا مجموعہ نہ تھا، بلکہ صرف کام کرنیوالوں اور کام چاہنے والوں کا مجمع تھا، تیسری چیز یہ تھی کہ اس کے احاطہ میں مذہب صرف فیشن کے لیے نہ تھا، بلکہ دل اور عمل کے لیے تھا،

مجلسِ خلافت کے متعلق ایک بات صاف صاف کہنی چاہیے کہ اس مجلس کی اصل بنیاد گو خلافت کے قیام اور حجاز کی حقیقی آزادی پر رکھی گئی تھی، تاہم کچھ ملکی کام بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لیے تھے، خارجی ممالک کے معاملات میں ہم عملی کام بجز تہنیت اور اظہار افسوس اور وفد بھیجنے، مشورہ دینے اور روپیہ جمع کرنے کے اور کیا کر سکتے ہیں؟ حالات بدلتے جارہے ہیں، اور اسی نسبت سے ہم کو اپنے رویہ میں بھی تبدیلی کرنی چاہیئے، نئے انقلاب کی سب سے بڑی یادگار ہمارے پاس جامعہ ملیہ ہے، مجلسِ خلافت کو اب اس کو اپنا کام سمجھنا چاہیئے، اور اسی اصل کے ماتحت اوس کو اپنی تمام تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کرنا چاہیے،

امسال کے اجلاسِ خلافت میں سب نے اس کو محسوس کیا ہے کہ کوئی بڑا کام استقلال اور مضبوطی سے

مسلمانوں سے اس وقت تک بن نہیں سکتا، جب تک ان میں دماغی انقلاب و اصلاح پیدا نہ ہوں، اور اسکے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں مکتب، دارالمطالعہ اور مدرسۂ تبلیغ کا جال بچھا دیا جائے، اسکے متعلق امسال ایک برمحل تجویز منظور کیگئی ہے، اور گویا یہی تجویز امسال کے اجلاس کا حاصل ہے اور یہی اصل کام ہے،

امسال کانپور سے علی گڈھ جانے والوں کو یہ صاف نظر آگیا کہ دونوں مجمعوں کی ذہنیتوں میں کیا فرق ہے؟ علی گڈھ کے میدان میں داخل ہونے کے ساتھ چہل پہل، رونق اور نمائش کا پوری طرح اظہار ہو رہا تھا، ڈھائی ہزار طلبہ کے ساتھ چند ہزار مہمانوں کی لال ٹوپیوں اور سیاہ کپڑوں میں آمد و رفت نظر فریب منظر تھا، اور بلی جلی صورتیں شرکائے جلسہ کی کثرت و قلت کے مسئلہ کے لیے ہمیشہ پردہ پوش رہیں، معلوم ہوتا تھا کہ ادھر پانچ چھ برسوں سے جن فیشن ایبل لیڈروں، رہنماؤں، سرکاری عہدہ داروں، رئیسوں اور قومی تماشائیوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ سب کے سب ایک دفعہ ابل پڑے تھے، کہ ہمارا پرانا زمانہ قسمت سے پھر عود کر آیا، ہمارے جاہ و جلال کا تخت دوبارہ بچھے گا اور قوم کی باگ ایک دفعہ پھر ہمارے ہاتھوں میں آگئی،

علی گڈھ کی سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر نشین کی نشستگاہ کے اوپر علی گڈھ کے کسی خوش مذاق شاعر کا جلی حرفوں میں کپڑے پر لکھکر یہ شعر آویزاں کیا گیا تھا،

وفا شعاری و حبِ وطن و دیں پرستی کی علامت

کہ اپنے قومی نشان میں تاج اور کھجور اور ہلال بھی ہے

یہ صحیح و فصیح و بلیغ شعر جس کے موزوں پڑھنے میں متعدد باکمال شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی پڑی، درحقیقت علی گڈھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی، جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی، منتظمین کار کو داد دینی چاہئے

کہ انھوں نے علی گڈھ کا دل نکالکر سب کے سامنے رکھدیا تھا،

اردو کی بیکسی کا یہاں بھی وہی عالم تھا، کانفرنس تک تو کچھ خیریت تھی، در نہ سات روز کے اندر کم کسی مشہور لیڈر نے اردو کو شرف بخشا، الا یہ کہ انگریزی نے خود ان کو اپنی واقفیت کے شرف سے محروم کیا ہو، تاہم دو چار سیکھے اور رٹے ہوئے فقروں کا برمحل اور بے محل بولدینا تو ضروری تھا، اردو کتب فروشوں نے بھی مسلم یونیورسٹی کا نام سنکر اپنی کتابوں کی دکانیں سجائی تھیں، مگر شاید ہی کسی سپید پوش سیاہ پوش نے ادھر نظر اٹھائی ہو، اور اس پر اردو کی بیکسی کا ادبی اسٹیج پر ماتم ہے،

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

جوبلی کا اجلاس ہر حیثیت سے نہایت شاندار تھا، کئی ہزار کا مجمع تھا، بجز دو طبقہ کے ہر طبقہ کے مسلمان بھی تھے، انگلستان اور ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے نمایندے بھی تھے، وایسرائے، حضور نظام، دیگر حکام اور مسلمان رؤسا کے تہنیت نامے بھی آئے تھے، افغانستان کی تعلیمی نمایندگی بھی ہو رہی تھی اور لوگوں کو اس سے بیحد دلچسپی بھی تھی، قوم کے مدعیان رہنمائی اور مشاہیر بھی تھے، اور یہ ایک دلچسپ نظارہ تھا، مگر ان لال ٹوپیوں کے بیچ میں ہماری آنکھیں جبہ و دستار کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں، السنۂ مغربی کی یونیورسٹیوں کے نمایندوں کی صف میں ہم اپنی مشرقی درسگاہوں کے فضلاء کو بھی دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے، مگر وہ نہ تھے،

بہرحال ایک خاص خیال کے مسلمانوں کا نہایت مغتنم مجمع فراہم ہو گیا تھا، موقع تھا کہ واقعی علی گڈھ تحریک کے پنجاہ سالہ جد و جہد پر ایک تبصرہ کیا جاتا، اور اگر مسلمان دوسرے رہنماؤں کی غلط پیروی میں برباد ہو رہے ہیں، تو ان کو صحیح ہدایت کیجاتی، اور مسلم یونیورسٹی کو صحیح مسلمان یونیورسٹی بنانے کے لیے غور کیا جاتا

اور امراء کی جیبوں کو ٹٹولنے کے علاوہ ارباب دانش کے سینے بھی ٹٹولے جاتے اور آیندہ کیلئے قوم کی تعلیمی علمی جد و جہد کیلئے ایک پروگرام بنایا جاتا، علی گڈھ تحریک نے مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچایا ہے اور نقصان بھی پہنچایا ہے، کاش اصحاب علیگڈھ سکون خاطر کیساتھ پچاس برس کے قطع مسافت کے بعد ایک دفعہ پیچھے مڑکر دیکھ بھی لیتے کہ ہم کہاں تک صحیح راستہ پر چلے اور آیندہ منزلوں کے طے کرنے کیلئے کیا ضرورتیں ہیں؟ اور کیا صحیح مشورے ہیں؟

——— ❊ ———

قیامت ہے مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی کا نادر موقع جو پچاس برس کے بعد آیا تھا، اور اب پچاس ہی برس کے بعد آئے گا، اوسکی افتتاحی اور صدارتی تقریر جو پنجاہ سالہ تجربوں کا نچوڑ اور حسب وعدہ قوم کی پنجاہ سالہ جد و جہد اور سعی و کوشش کا جائزہ اور آیندہ پچاس برس کا پروگرام ہوتی، وہ محض وقتی زبانی خوش کن ظرافتوں، چٹکلوں اور گذشتہ دعووں کا اعادہ تھی، اللھم ارحم امۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم،

——— ❊ ———

تعلیمی اور علمی حیثیت سے جوبلی میں سب سے بہتر تقریر شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر (پنجاب) کی تھی، انھوں نے بالکل بجا طور پر مسلم یونیورسٹی کو ایک علمی یونیورسٹی بنانے کا صحیح مشورہ اور صحیح نقشہ پیش کیا، جس میں مشرقیات، علوم عربیہ، اور اردو کو صحیح جگہ دیگئی تھی، کاش شیخ صاحب کی یہ مفید تقریر آیندہ ہماری مسلم یونیورسٹی کا نظام عمل اور طریقہ کار بن سکتی، جامعۂ عثمانیہ کے کامیاب تجربہ کے بعد اب اردو کے ذریعہ تعلیم بننے میں کسی کو کیا عذر ہو سکتا ہے؟

——— ❊ ———

ایجوکیشنل کانفرنس کی بہار کے دن تو مدت ہوئے گذر چکے، امسال توقع تھی کہ اس غیر معمولی مجمع کے موقع پر اسکی کرسیاں بھی خالی نہ رہیں گی، مگر واقعہ ایسا نہ ہوا، لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اپنے قدیم طلبگاروں کی موجودگی میں بھی اسکی یہ بے رونقی افسوس کا باعث تھی، چند سال سے مسلمان خواتین کو کانفرنس میں اپنے مناسب حق نہ ملنے کی یہ خلش تھی، امسال یہ حق زبردستی حاصل کر لیا گیا، اور خود کانفرنس کے اسٹیج سے دو خاتونوں کی طلب حق کے لیے "بغاوت انگیز" تقریریں ہوئیں، کانفرنس کی تجویزیں اسی پرانی بولی اور

اصطلاحوں میں تھیں جواب صرف ایجوکیشنل کانفرنس کے "نوری ممبروں" کی زبانوں سے سنی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سالانہ عرض و معروض کا آخر حاصل کیا ہے؟ بجز اس کے کہ

حافظ وظیفۂ تو دعا کردن است و بس
در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید

——— ❊ ———

ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر صاحبزادہ سر عبد القیوم کی طرف سے جو صدارتی خطبہ پڑھا گیا، ہمارے خیال میں خیالات اور مشوروں کے لحاظ سے اوس کے اکثر حصے بیحد عمدہ تھے، خصوصاً تعلیمی نصب العین، (مطالعہ و تحقیق طلب میں) اور ذریعۂ تعلیم کے عنوانوں کے ماتحت نہایت عاقلانہ اور سودمند تجویزیں پیش کیگئی ہیں، صاحبزادہ صاحب کا یہ پورا خطبہ علمی نقطۂ نظر سے صد درجہ قابل غور ہے، اور یہ وہی روح ہے جو ان کے ماتحت اسلامیہ کالج کے بعض مسلمان فاضل پروفیسروں میں ہے،

متاع خویش ز ہر دکان کہ باشد

امید ہے کہ اسلامیہ کالج پشاور بھی ان سے عملاً فائدہ اٹھائے گا،

——— ❊ ———

تنظیم کانفرنس، علی گڈہ میں ہوئی، مگر اس کا علی گڈہ میں ہونا پسند نہ آیا، اور آج نہیں تو کل تنظیم کے کار فرماؤں کو اس بے جوڑ اور انمل صحبت پر خود افسوس آئیگا، تنظیم کے مقاصد سے کسی مسلمان کو شاید ہی اختلاف ہو سکتا ہو، بحث صرف اسکی ہے کہ آیا اس کام کے لیے کسی الگ مجلس کی بھی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور جن لوگوں کو ملانے کے لیے یہ الگ بن رہی ہے وہ آگے چلکر کچھ مفید بھی ہو سکیں گے یا نہیں؟ بہرحال اس قابل غور نقطے سے آگے بڑھکر جو کچھ بھی اس کے ہال میں کہا گیا درست تھا، شیخ عبد اللہ علی یوسف صاحب کی تقریر میں صحیح ضرورتوں کا احساس اور صحیح علاج درج ہے، تنظیم کی تجویزوں میں سب سے اہم چیز ایک خدام الاسلام تربیت گاہ کا قیام ہے،

مسلم یونیورسٹی کا نوو کیشن میں سب سے پہلے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری کے لیے ہمارے کاروان کے آخری نقش قدم نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا نام پیش ہوا، موصوف کا اس اعزاز کے لیے استحقاق بداہت سے بھی زیادہ روشن ہے، کہ اس سے اگر نواب صاحب کے سابق علمی اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، تو ہماری یونیورسٹی کے سابق علمی اعزاز میں ضرور اضافہ ہوا،

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

علی گڈھ میں ہز ہائنس مہاراجہ الور کی تشریف آوری کئی حیثیتوں سے یادگار رہی، اولاً تو نفس ایک والی ملک کی ایک علمی و تعلیمی مجمع میں آمد، دوسرے اس موقع پر ملک کے مسلمان والیانِ ریاست کا تغافل اور ہندو خود مختار رئیس کی فرض شناسی، پھر نہ صرف آنا، بلکہ تقریر کرنا، اور ایسی تقریر کرنا کہ اسکی فصاحت و بلاغت، اشعار کی نزاکت، تاریخی حوالوں، اخلاص و محبت کی زبان، ہندو مسلم اتحاد کی خواہش، مذاہب کا سچا ادب دیکھ کر لوگ عش عش تھے، اور بڑے بڑے طمطراق والے بھی حیرت سے انگشت بدنداں تھے، اور اسی تعجب و حیرت کے سکون اور جوش و خروش کے نعروں میں مہاراجہ صاحب نے ۲۵ ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا،

مہاراجہ صاحب کو جو ایڈریس یونیورسٹی کی طرف سے دیا گیا، اس میں اس بات کا خاص طور سے تذکرہ تھا، کہ افسوس ہے کہ "ہمارے پاس **دینیات** کے صیغہ کے لیے سرمایہ نہیں" ہندو والی ملک نے نہایت خندہ جبینی سے مسلمانوں کی دینیات کی تعلیم کے لیے ۵ برس کے لیے ۵ ہزار سالانہ کا عطیہ پیش کیا، اور انھوں نے قبول کیا، اور صدر سے لیکر پائیں تک اس کے لیے اس زور شور کی تالیاں گونجیں کہ کان کے پردے اڑ گئے، اس خوشی اور شادمانی کے غل میں ایک حزیں و مغموم آواز عالم سروش سے آئی،

نامِ رقیب برلب جانانِ من گذشت واقف نشد کسے کہ چہ برجانِ من گذشت

اور کسی کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے متعلق سنا ہو کہ انھوں نے یہ آواز سنی! کیا ہمارے رؤسائے دین پرور اس پانچ سال کی رقم کو خود دائمی نہیں بنا سکتے؟

مسلم لیگ کا اکھاڑا اسال نہایت شاندار تھا، وہ تمام سیاسی رہنما جو اسی مسلم لیگ کی کرسی سے اٹھ اٹھکر سرکاری مناصب عالیہ حاصل کر چکے تھے، اپنی اپنی باری پوری کر کے پھر اسی مسلم لیگ کی کرسیوں پر فرصت کے خالی گھنٹوں کو پُر کرنے کیلئے جلوہ فرما تھے، سر عبدالرحیم کا خطبۂ صدارت اون کے عظیم الشان روایات کے بالکل خلاف تھا، اور صرف اسلیے اوسکو پسند کیا جاسکتا ہے کہ وہ مہاسبھا کی صدارتی تقریروں کا جواب بالمثل تھا، دو روز کے اجلاس میں جو کچھ ہوا وہ الفاظ کی سحر کاری، مذہب کی نمائش اور لفظ آزادی کے مجازی استعمال سے زیادہ نہ تھا،

علمی دنیا میں نئے سال کا سب سے افسوسناک سانحہ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کی وفات ہے، موصوف نے اس مہینہ کے آغاز میں غالباً ساٹھ پینسٹھ سال کی تخمینی عمر میں انتقال کیا، وہ پہلے کیمبرج میں فارسی کے لکچرر تھے، پھر ۱۹۰۲ء میں وہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، انھوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، عربی میں وہ پروفیسر پامر کے شاگرد تھے، انکی سب سے جامع، مبسوط اور مشہور تصنیف لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی ضخیم جلدیں ہیں، موصوف نہ صرف علمی حیثیت سے، بلکہ ایک بے تعصب عالم ایک ہمدرد مشرق، اور ایک شریف انسان ہونے کے لحاظ سے بھی نہایت بلند درجہ تھے، قومی تنگ ظرفی، اور مذہبی عصبیت سے وہ قطعاً مبرا تھے، ان آنکھوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ انھوں نے مرنے والے کی زیارت کی تھی، آیندہ معارف میں ان کے کچھ حالات سپرد قلم ہونگے، ہندوستان میں ان کو ہم سے بہتر جاننے والے اشخاص بلکہ ان کے شاگرد موجود ہیں، کیا بہتر ہو اگر ان میں سے کوئی صاحب ہماری مدد فرمائیں اور براؤن پر ایک عمدہ مضمون لکھکر عنایت فرمائیں، اور اگر احباب پسند کریں تو معارف کا ایک نمبر صرف براؤن پر شائع کیا جائے کہ انکے احسانات کا یہ ادنیٰ ترین معاوضہ ہے،

مقالات

محمد بن عمر الواقدی

اور سیرۃ میں

علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی

سیرۃ کے مشہور راویوں میں سے ایک محمد بن عمر واقدی ہے، ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۰۷ھ میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں پیدائش ہوئی، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، اور قضا کا منصب حاصل کیا، ابتدائی مصنفین سیرت میں اس کا شمار ہے، سیرت میں اسکی ایک کتاب ہے جس کا نام کتاب المغازی ہے، جس میں عہد نبوت کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے، اگلے مصنفین کا یہ حال تھا کہ چونکہ وہ ہر واقعہ کو اور واقعہ کے ایک ایک جزء کو الگ الگ سلسلہ سے بیان کرتے تھے اس لیے واقعہ کا تسلسل بیچ بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا جس سے عام لوگوں کی دلچسپی کم ہو جاتی تھی، واقدی نے یہ طرز اختیار کیا کہ پورے واقعہ یا پورے غزوہ کے سارے راویوں کا نام شروع میں گنا دیا اور ایک دلچسپ مسلسل داستان کی صورت میں پورے واقعہ یا پورے غزوہ کو بیان کر دیا، اس طرز سے عام لوگ جو روایتوں کے پُرپیچ عالمانہ سلسلوں میں پھنسکر اپنا لطف مطالعہ نہیں کھونا چاہتے تھے، انھوں نے اوسکی کتاب کو بیحد پسند کیا، اور خلفائے عباسیہ اور دیگر امرائے بزم کی نگاہ میں اس نے بڑا رتبہ پیدا کیا لیکن جس قدر امراء اور سلاطین کے ہاں اسکی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اسی قدر علمائے زمانہ ائمہ حدیث اور معتبر بزرگوں کی مسند اعتبار سے اوسکو دوری حاصل ہوتی گئی،

اس بات پر مخالف و موافق رائے شہادتیں متفق ہیں کہ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، اور اسی قوت حافظہ کی بنا پر اوس کو خاص امتیاز ہے، چنانچہ اس کے کاتب محمد بن سعد نے طبقات (۵-۲-۳۱۴) میں لکھا ہے،

وکان عالما بالمغازی والسیرة والفتوح وباختلاف الناس فی الحدیث والاحکام واجتماعهم علی ما اجتمعوا علیه،

وہ مغازی، سیرۃ، فتوحات اور حدیث و احکام میں لوگوں کے اختلافات اور جن امور پر اون کا اجماع ہے، ان کا عالم تھا،

مجاہد بن موسیٰ کا قول ہے کہ میں نے واقدی سے زیادہ حفظ یاد رکھنے والے سے نہیں لکھا، حافظ ذہبی میزان میں اس قول کو لکھکر کہتے ہیں،

قلت وصدق کان الی حفظه المنتهی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس والفقه وغیر ذلك

میں کہتا ہوں کہ یہ بات سچ ہے، واقدی کے حافظہ، تاریخ، سیر، غزوات، وقائع اور لوگوں کے حالات اور فقہ میں انتہا ہے،

معصب زبیری کہتے ہیں،

والله ما رأینا مثل الواقدی قط

بخدا ہم نے واقدی کا مثل نہیں دیکھا،

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں کہتے ہیں

هو ممن طبق الارض شرقها وغربها ذکره ولم یخف علی احد عرف اخبار الناس امره، وسارت الرکبان بکتبه فی فنون العلم من المغازی والسیر والطبقات واخبار النبی صلعم والاحداث الکائنة فی وقته وبعد وفاته

یہ ان لوگوں میں سے ہے جنکی شہرت نے زمین کے مشرق و مغرب کو گھیر لیا ہے، اور جو شخص کہ تاریخ سے واقف ہے اس سے اس کا حال چھپا نہیں ہے، مغازی، سیر اور طبقات اور آنحضرت صلعم کے حالات اور جو واقعات آپ کے زمانہ میں ہوئے اور آپکی وفات کے بعد ہوئے، ان چیزوں میں اسکی کتابوں کو لوگ ہر جگہ لیے پھرتے ہیں،

یہ واقدی کے علم و حفظ کے وہ واقعات ہیں جنپر سب کا اتفاق ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ واقدی دثوق،

اعتبار اور سند کے لحاظ سے کس رتبہ کا آدمی ہے؟ بعض لوگوں نے اس کے موافق شہادت دی ہے، مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقفکاروں کا بڑا حصہ جس میں امام شافعی، امام ابن حنبل، امام بخاری وغیرہ داخل ہیں، اوس کو بے اعتبار جھوٹا اور دروغگو کہتا ہے، اور اسی لیے اوسکی روایتوں کو محدثوں نے حدیث اور احکام کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے، اور نیز علماء کے نزدیک اوسکی کتاب المغازی کو وہ حیثیت نہیں حاصل ہوئی، جو محمد بن اسحاق کی سیرت کو حاصل ہوئی، بہرحال واقدی کی کتاب المغازی ایک نادر وکمیاب کتاب تھی اور ہم علمائے مستشرقین کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو چھاپکر وقف عام کیا،

سنہ ۱۸۵۰ء کے پس وپیش عہد میں جرمن عالم ڈاکٹر اسپرنگر کے بدولت ہندوستان میں عربی کتابوں کی اشاعت کا نادر موقع بہم پہنچا، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس باب میں خاص اہمیت حاصل کی، صحابہ کے حالات میں حافظ ابن حجر کی تصنیف الاصابہ فی تمییز الصحابہ کی اشاعت سے ڈاکٹر اسپرنگر اور ایشیاٹک سوسائٹی کو خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر پہلے یورپین عالم ہیں جنھوں نے عربی ماخذوں سے "دی لائف آف محمدؐ" ترتیب دی، اور اسلیے اس نے یورپ کے علمی حلقوں میں ایک جگہ پیدا کرلی،

اے، وان، کریمر (A. VAN KREMER) جو مشہور یورپین مستشرق ہیں، اور سرکاری تعلق یعنی آسٹریا کے وکیل مطلق کنسولیٹ جنرل کی حیثیت سے اسکندریہ (مصر) میں مقیم تھے، انھوں نے واقدی کی کتاب المغازی کا واحد نایاب نسخہ دمشق کے ایک کتبخانہ میں پایا، جون سنہ ۱۸۵۴ء میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اسکندریہ میں الفرڈ وان کریمر صاحب سے ملاقات کی، اور اونکی کتاب المغازی واقدی کا نسخہ دیکھا، اور ان کو آمادہ کیا کہ ببلوتھیکا انڈیکا کے سلسلہ میں وہ اس کو مرتب (اڈٹ) کریں اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپوائیں، فروری سنہ ۱۸۵۶ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو یہ کتاب چھپ چکی ہے یعنی سنہ ۱۸۵۵ء میں وہ چھپ چکی تھی، بہرحال ابن ہشام کے بعد سیرۃ نبوی میں یہ دوسرا ابتدائی ماخذ تھا، جو یورپ کے ہاتھ آیا، اس لئے اس کے ساتھ خاص اہتمام برتا گیا، ولہاوسن نے سنہ ۱۸۸۲ء میں "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے جرمنی میں اس کا ترجمہ شائع کیا، اور یہ بڑی حد تک یورپ کے

مستشرقوں میں سند اور ماخذ قرار پایا، چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء میں پروفیسر مارگیولیوتھ نے انگریزی میں محمد اور ترقی اسلام کے نام سے سیرۃ میں جو فاضلانہ کتاب تصنیف کی ہے، اور جسمیں پہلی دفعہ ایک مستشرق نے سیرۃ میں احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، اور اسلیے وہ خاص اعتنا کی مستحق ہے، اس میں بھی وہ ولہاوسن سے مستغنی نہ ہو سکے، اور کتاب المغازی کے اصل عربی نسخہ کے بجائے ولہاوسن ہی کے ترجمہ کو اونھوں نے قابل قبول سمجھا،

اتنی تمہید کے بعد اب اصل مقصد سنئے، ابھی حال میں مانچسٹر گارجین اخبار (انگلستان) میں ایک مضمون نگار کی جس میں مضمون نگار نے ایسے فقرے لکھے ہیں جنسے حضور انور صلعم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے، منجملہ اُن کے ایک فقرہ یہ ہے کہ "آپ ایسے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ بدر میں جب خون بہتے دیکھا تو آپ کو غش آگیا"، ایک مسلمان نے مضمون نگار سے اس واقعہ کا حوالہ دریافت کیا، تو اس نے مارگیولیوتھ کی کتاب کا حوالہ دیا، مارگیولیوتھ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں (صفحہ ۲۵۹) میں بے حوالہ نقل کیا ہے، اسلیے مارگیولیوتھ صاحب سے اس کا ماخذ دریافت کیا گیا تو انھوں نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاوسن کا حوالہ دیا، اس پر واقدی کے معتبر و غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے پچھلی ڈاک سے یہ پوری خط وکتابت میرے پاس بھیجدی ہے، اس کو پڑھکر یورپین مستشرقین کے علمی تبحر اور فضل وکمال کی ایک اور عمدہ مثال ہاتھ آگئی، پروفیسر مارگولیوتھ اپنے کرمنامہ میں لکھتے ہیں،

مورخہ ۴ نومبر سنہ ۱۹۲۵ء　　اوکسفورڈ

"جناب من! میرا خیال ہے کہ مضمون نگار نے "محمد اور ترقی اسلام" کے حسب ذیل فقرہ کا حوالہ دیا ہے (صفحہ ۲۵۹)

"جب خون کا پہلا قطرہ بہایا گیا تو پیغمبر اپنے جھونپڑے میں واپس آئے اور نڈھال ہو کر غش کھا گئے" FAINTED

یہ بعینہ واقدی کے الفاظ ہیں، برٹش میوزیم، (۱) جس کا ترجمہ ولہاوسن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے برلن میں سنہ ۱۸۸۲ء میں کیا ہے، (صفحہ ۵۴) "کہ جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو محمد نڈھال ہو کر غش کھا گئے FAINTED

واقدی آگے کہتا ہے کہ محمد بہرحال بہت جلد ہوش میں آگئے" یہ روایت کی دوسری شکل میں ہے (صفحہ ۵۸) کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو محمد نے دعا کی، ابوبکر نے تسلی دی، "صحیح مسلم مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۲۹۰ھ جلد ۲ صفحہ ۵۵ اور واقدی صفحہ ۵۵

سے یہ ظاہر ہے کہ یہ وحواس بیہوشی کے دورہ سے افاقہ کے بعد مانگی گئی تھی یعنی نے واقدی کے اس فقرہ کو کہ "جب فوجین ایک دوسرے کے مقابل آئیں،، اس طرح ادا کرنے میں کہ جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا، خود واقدی کا مطلب ادا کردیا ہو،

خواجہ صاحب نے جب پروفیسر مارگولیتھ کو لکھا کہ واقدی کا حوالہ بیکار ہے کہ وہ مسلمانوں میں معتبر نہیں، تو موصوف نے یاقوت حموی کی کتاب معجم الادبار کی جلد، کا جو ہنوز اونکی اڈیٹرشپ میں زیر طبع ہے اس کا حوالہ دیا کہ یاقوت نے لوگوں سے اوسکی توثیق نقل کی ہے، خط کی عبارت یہ ہے،،

مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء

جناب من! میں فرصت کے وقت اوس نقطہ پر غور کرونگا جدھر آپ نے مجھکو متوجہ کیا ہے، اور یہ مجھ کو اس صدمہ سے بھی نجات دلانے کیلئے تھوڑا سا وقت لیگا کہ آپ واقدی ایک مسلمان مورخ کو جو بہت سے مستند اصحاب کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے، "ایک مشہور دروغگو" کہتے ہیں، وہ ائمہ اسلام جو واقدی کو اس نظر سے دیکھتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ ہر حیثیت سے بالکل معتبر ہے، یاقوت نے معجم الادبار کی ساتویں جلد میں جو ابھی زیر طبع ہے "ان کو گنایا ہے"،،

سب سے پہلے ہم کو پروفیسر مارگولیتھ صاحب کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے، کہ انھوں نے واقدی کی توثیق اور معتبر ہونے کے لیے یاقوت کا حوالہ دیا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب وجغرافیہ وتاریخ کا آدمی ہے، اوسکو اشخاص کی جرح وتعدیل سے کیا تعلق ہے؟ ہمارے پروفیسر صاحب کو واقدی کے معتبر شمار کرانے میں خاص انہماک ہے، سنہ ۱۵ یا سنہ ۱۹۱۶ میں جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے بلاوے پر ہندوستان آئے تھے تو لکھنؤ میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس ملاقات میں بھی دانستہ یا نادانستہ واقدی ہی کی معتبری ونامعتبری کی بحث چھڑ گئی تھی، میں نے کہا تھا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے جسکا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہوسکتا، تاریخ وسیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانحعمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "امام شافعی کی نسبت کیا کہتے ہو کہ وہ اس سے روایت کرتے ہیں"؟ میں نے کہا اگر یہ درست ہے تو نفس روایت کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ

امام نے اوسکی توثیق کی ہے، درانحالیکہ کتب نقد میں یہ صاف تصریح ہے کہ امام موصوف اوسکی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے،

بہر حال اب معجم الادبار کی اڈیٹری کی تقریب سے پروفیسر صاحب کو واقدی کے مداحوں کے چند نام اور ہاتھ آئے ہیں، لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ واقدی کی توثیق کے لیے ایک ادیب وجغرافی واخباری کی تصنیف کے حوالہ کی ضرورت نہیں، واقدی کی حمایت میں جو اقوال اسکے اندر ہونگے، وہ ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں، آٹھویں صدی میں یاقوت نے جو کچھ جمع کیا ہے وہ سب آٹھ صدیوں کی جرح وتعدیل کی کتابوں میں مذکور ہے، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی کا حامی اور مدافع علامہ ابن سید الناس اندلسی المتوفی ۷۳۴ھ سے زیادہ کوئی نہیں، انھوں نے ان دونوں کے متعلق جسقدر توثیق اور استناد کے اقوال تھے سب کو اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والتاریخ والسیر کے مقدمہ میں سب یکجا کر دیا ہے، اسی کے ساتھ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اون کے مخالف وموافق جو کچھ کہا گیا ہے سب جمع کر دیا ہے، اس سے کچھ زیادہ یاقوت کی متوقع جلد میں نہ ہوگا،

نفس واقعہ ہی کی تحقیق کے لیے بحث کی تین منزلیں ہیں، واقدی کی حیثیت، اس کی کتاب المغازی کی حیثیت، اصل واقعہ کی صورت،

واقدی کی حیثیت

واقدی کے حافظہ اور کثرت معلومات کی شہادتیں اوپر گذر چکی ہیں، امام شاذ کونی نے اسکے متعلق ایک نہایت ظریفانہ فقرہ کہا ہے کہ "واقدی بہر حال بہت بڑا آدمی تھا، اگر وہ جھوٹا تھا تب بھی بہت بڑا آدمی تھا اور اگر سچا تھا تب بھی بہت بڑا تھا" واقدی کی ذات آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے معرض بحث میں رہی ہے اور اس کا سلسلہ خود اوسکی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا بدقسمت راوی شاید ہی ملے گا جسکی ایک آدھ نے توثیق نہ کر دی ہو، اس لیے علمائے اصول کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مخالف یا موافق دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھکر اور اون کو باہم تول کر اوس کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں، واقدی کا بھی یہی حال ہے، چنانچہ اوس کے متعلق مخالف وموافق دونوں پہلو حسب ذیل ہیں،

اوس کے مواقق پہلو کا روشن حصہ یہ ہے کہ اوس کے علم و حافظہ کی سب نے تعریف کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام مالک سے قتل ساحرہ کی نسبت دریافت کیا گیا تو امام نے فرمایا دیکھو واقدی کے پاس اس کے متعلق کچھ ہے، لوگوں نے اوس سے پوچھ کر امام کو اطلاع دی، تو لوگ کہتے ہیں کہ امام نے اس پر قناعت کی، اسی طرح ایک دفعہ اور امام سے کسی نے دریافت کیا کہ خیبر کی اوس یہودی عورت کو جس نے آپ کے کھانے میں زہر ملایا تھا، آپ نے کیا برتاؤ کیا، امام نے فرمایا کہ مجھکو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اہل علم سے دریافت کروں گا، چنانچہ امام نے واقدی سے ملاقات کی تو دریافت کیا، اور حلقہ میں آکر فرمایا کہ اہل علم نے یہ جواب دیا، دراوردی ایک ناقد حدیث ہیں اون سے کسی نے پوچھا کہ واقدی کے متعلق آپکی کیا رائے ہے؟ انھون نے جواب دیا تم واقدی کو مجھسے پوچھتے ہو، تم واقدی سے مجھ کو پوچھو، یہی جواب ابو عامر عقدی اور معن بن عیسیٰ نے بھی دیا ہے،

ان اقوال کے علاوہ میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور عیون الاثر میں جن علماء نے جن الفاظ میں اسکی توثیق کی ہے، وہ حسب ذیل ہیں،

نام	اصل قول	ترجمہ
دراوردی،	الواقدی امیر المؤمنین فی الحدیث،	واقدی حدیث میں مسلمانون کا امیر ہے،
یعقوب بن شیبہ،	حدثنی بعض اصحابنا انہ ثقۃ،	ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ وہ ثقہ ہے،
مصعب زبیری،	ھو ثقہ مامون	وہ ثقہ اور مامون ہے،
ابن نمیر،	اما حدیثہ ھنا فھو مستو اما حدیث اھل المدینۃ فھم اعلم بہ،	اسکی حدیث یہان تو برابر ہے لیکن اہل مدینہ کی حدیث تو وہ اس سے زیادہ واقف ہیں، (یعنی اس کے متعلق وہ فیصلہ کرین)
ابراہیم حربی،	الواقدی امین الناس فی الاسلام،	واقدی اسلام میں لوگوں کا امین ہے،
محمد بن اسحاق الصنعانی	لولا انہ عندی ثقۃ ماحدثت بہ،	اگر وہ میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتا تو میں اس سے روایت نہ کرتا

یزید بن ہارون،	الواقدی ثقہ	واقدی ثقہ ہے،
عباس عنبری،	ھو احب الی من عبد الرزاق	وہ مجھے عبد الرزاق سے زیادہ پسند ہے،
ابو عبید القسم بن سلام،	ثقہ،	وہ ثقہ ہے،
مسیبی،	ثقہ	وہ ثقہ ہے،

یہ واقدی کے طرفدارون کی سب سے بڑی فہرست ہے مگر یہ دیکھ لو کیا ان میں کوئی بھی مشہور امام ہے، فن نقد کے اساطین اعلام میں سے کسی کا نام ہے؟ بے شبہہ یہ لوگ بھی قابل وقعت ہیں اور ان سے بڑی مخالف شہادتیں اگر موجود نہ ہوتیں، تو اونکی موافق شہادتیں بڑا درجہ رکھتیں، مگر حالت یہ ہے کہ خود ان طرفدارون میں سے بھی جو لوگ اوسکی حالت سے واقف ہوگئے "انھوں نے اس کو چھوڑ دیا، چنانچہ ابن نمیر جنھوں نے یہ کہا ہے کہ اوسکی حدیث یہان ٹھیک ہے" انھوں نے بھی اوسکو چھوڑ دیا (تہذیب) ابن سعد جو واقدی کا کاتب تھا اور جس سے اوسکی حمایت کی امید ہوسکتی ہے، دو صفحوں میں اس نے اوس کا حال لکھا ہے، مگر ایک حرف بھی اوسکی توثیق اور اعتبار و استناد کے متعلق نہیں لکھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ "اوسکی کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں"، سب سے بڑے ناقد فن اور امام حدیث امام بخاری اپنی تاریخ صغیر میں جو اس وقت اسماء الرجال کی سب سے پرانی دستاویز ہمارے پاس ہے، واقدی کے متعلق محدثین کا یہ طرز عمل ظاہر کرتے ہیں، (مطبوعہ الہ آباد صفحہ ۲۲۸)

محمد بن عمر الواقدی ابو عبد اللہ الاسلمی مدنی قاضی بغداد ترکوہ،	محمد بن عمر واقدی ابو عبد اللہ اسلمی، مدینہ کے ہیں، بغداد کے قاضی تھے، محدثین نے اونکو چھوڑ دیا ہے،

امام ممدوح کتاب الضعفاء الصغیر میں فرماتے ہیں، (مطبوعہ الہ آباد صفحہ ۳۲)

متروک الحدیث،	وہ متروک الحدیث ہے،

امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ جنکی تصنیف حدیث کی چھ معتبر کتابوں میں سے ایک ہے، اپنی تصنیف کتاب الضعفاء والمتروکین میں کہتے ہیں،

متروک الحدیث (الرآباد صفحہ ۲۲۰) وہ متروک الحدیث ہے،

امام موصوف اسی کتاب میں لکھتے ہیں (صفحہ ۳۵)

والکذابون المعروفون بوضع الحدیث علی رسول اللہ صلعم اربعۃ ابن ابی یحیی بالمدینۃ والواقدی ببغداد ومقاتل بن سلیمان بخراسان ومحمد بن سعید بالشام،

اور وہ جھوٹے جو حضور انور صلعم پر حدیث گھڑ کر بیان کرنے میں مشہور ہیں، چار شخص ہیں، ابن ابی یحیی مدینہ میں، واقدی بغداد میں، مقاتل بن سلیمان خراسان میں، اور محمد بن سعید شام میں،

ان متفق علیہ اماموں کے فتوی کے بعد واقدی کے طرفداروں کی حیثیت جس قدر رہجاتی ہے وہ ظاہر ہے،

اب آگے چلیے، رجال کی عام کتابوں تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی، وغیرہ کا جائزہ لیجیے، امام بخاری کے استاد ابن مدینی کہتے ہیں،

عندہ عشرون الف حدیث یعنی مالہا اصل وقال فی موضع آخر لیس ہو بموضع للروایۃ وابراہیم بن یحیی کذاب وہو عندی احسن حالا من الواقدی (تہذیب)

واقدی کے پاس ۲۰ ہزار حدیثیں ہیں یعنی انکی کوئی اصل نہیں ہے، دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ واقدی روایت کے کسی رتبہ میں نہیں ہے، ابراہیم بن یحیی بڑا جھوٹا ہے، مگر واقدی میرے نزدیک اچھا ہے،

ایک اور ان کا قول ہے،

الہیثم بن عدی اوثق عندی من الواقدی ولا ارضاہ فی الحدیث ولا فی الانساب ولا فی شیٔ (تہذیب و میزان)

ہیثم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ قابل اعتبار ہے میں واقدی کو حدیث میں اور نہ نسبوں کے بیان میں اور نہ کسی چیز میں پسند کرتا ہوں،

الواقدی یضع الحدیث، (میزان)

واقدی حدیث جعلی بنایا کرتا ہے،

امام شافعی فرماتے ہیں،

کان بالمدینۃ سبع رجال یضعون الاسانید واحد ہو الواقدی (تہذیب)

مدینہ میں سات آدمی تھے جو اسناد جعلی بنایا کرتے تھے، ان میں ایک واقدی ہے۔

اہل سنت کے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں

الواقدی کذاب (تہذیب)

واقدی بڑا جھوٹا ہے،

لم یزل امر الواقدی یدافع حتی روی عن معمر عن الزہری عن نبہان عن ام سلمۃ افعمیاوان انتما فجاء بشیٔ لاحیلۃ فیہ (تہذیب)

واقدی کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کیجاتی رہی، یہانتک کہ اوس نے معمر، زہری، نبہان اور ام سلمہ کے مسلسل واسطہ سے روایت کی تو اب اسکی مدافعت کا کوئی حیلہ باقی نہ رہا،

ہو کذاب یقلب الاحادیث (میزان)

وہ بڑا جھوٹا ہے، حدیثیں الٹ پلٹ ڈالتا ہے،

دیکھو فن کے اماموں نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے،

قال البخاری الواقدی متروک الحدیث ترکہ احمد وابن المبارک وابن نمیر واسمعیل بن زکریا، (تہذیب)

بخاری نے کہا واقدی متروک الحدیث ہے امام احمد، عبداللہ بن مبارک، ابن نمیر، اور اسمٰعیل بن زکریا نے اوس کو چھوڑ دیا،

علی بن مدینی بغداد آئے تو وہاں کے شیوخ کے حلقوں میں پھرے، واقدی کے حلقہ میں چلنے کی انکے رفیق نے سفارش کی تو ان کو متردد پایا، بالآخر بغداد کے امام احمد بن حنبل کو لکھکر استصواب کیا، امام نے یہ جواب دیا

کیف تستحل ان تکتب حدیث رجل روی عن معمر حدیث نبہان، (تہذیب)

تم اس شخص سے حدیث لکھنا کیسے جائز سمجھتے ہو جس نے معمر سے نبہان والی حدیث روایت کی،

فن نقد کے امام یحیی بن معین فرماتے ہیں،

ضعیف، لیس بشیٔ، کان یقلب حدیث یونس یغیرہا عن معمر، لیس بثقۃ (تہذیب)

ضعیف ہے، وہ کچھ نہیں، وہ یونس والی حدیث دوسرے کے نام بدل دیتا تھا وہ ثقہ نہیں ہے،

لیس بثقۃ لایکتب حدیثہ (میزان)

وہ ثقہ نہیں، اسکی حدیث نہ لکھی جائے،

صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک ابو داؤد کہتے ہیں،

لا اکتب حدیثہ ولا احدث عنہ ما اشک انہ کان یفتعل الحدیث، (تہذیب)

میں اوسکی حدیث نہیں لکھتا، اور نہ اس سے روایت کرتا، مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ وہ حدیث جعلی بنایا کرتا تھا،

امام ترمذی کے شیخ بندار کہتے ہیں،

ما رأیت اکذب منہ (تہذیب)

میں نے اس سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا،

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں،

ھو عندی ممن یضع الحدیث (تہذیب)

میرے نزدیک وہ اون لوگوں میں ہے جو حدیث وضع کیا کرتے تھے،

ابوزرعہ رازی، ابوبشر دولابی اور عقیلی کہتے ہیں،

متروک الحدیث، (تہذیب)

اسکی حدیث چھوڑ دیگئی ہے،

ناقد حدیث ابوحاتم رازی کہتے ہیں، کہ انھوں نے اور محدثین نے کیونکر اس کا امتحان لیا،

وجدنا حدیثہ عن المدنیین عن شیوخ مجھولین مناکیر قلنا یحتمل ان تکون تلک الاحادیث منہ ویحتمل ان تکون منھم ثم نظرنا الی حدیثہ من ابی ذئب ومعمر فانہ یضبط حدیثھم فوجدناہ قد حدث عنھما بالمناکیر فعلمنا انہ منہ فترکنا حدیثہ (تہذیب)

ہمنے مدینہ والوں سے اوسکی حدیث نامعلوم شیوخ سے روایت کی ہوئی منکر پائی، ہمنے کہا کہ ممکن ہو کہ یہ اسکی کارروائی ہے، یا اس کے ان نامعلوم استادوں کی ہو، پھر ہمنے غور سے اوسکی حدیث کو جو ابن ابی ذئب اور معمر سے تھی، دیکھا کیونکہ وہ ان لوگون کی حدیثوں میں ضبط رکھتا تھا، تو پایا کہ اوس نے ان دونوں بزرگوں سے بھی منکر روایتیں کی ہیں، تو ہمنے جان لیا کہ اسی کی کارروائی ہی، تو پھر ہمنے اوسکی حدیث چھوڑ دی،

ابوحاتم اور نسائی کا بیان ہے،

یضع الحدیث، (میزان)

وہ حدیث وضع کرتا تھا

دارقطنی،

فیہ ضعف (میزان)

اس میں کمزوری ہے،

جوزجانی

لم یکن مقنعا، (تہذیب)

وہ تسلی دینے والا نہیں،

ابن عدی،

احادیثہ غیر محفوظۃ والبلاء منہ (عیون الاثر)

اسکی حدیثیں غیر محفوظ ہیں، اور آفت اوسی سے ہے

واقدی کے متعلق اس کے معاصرین اور اس کے قریب العہد ناقدین کی جنمیں اسلام کے نامور ترین علما اور ائمہ داخل ہیں، یہ رائیں ہیں، غور کرو کہ ایسا شخص سیرۃ کے اہم مباحث میں کوئی قابل وقعت سند بن سکتا ہے؟ متاخرین نے اوسکی نسبت جو آخری اور اختتامی فیصلہ کیا ہے وہ بھی سن لیجئے،

امام نووی (صحیح مسلم کے شارح) شرح مہذب کتاب الغسل میں لکھتے ہیں،

الواقدی ضعیف باتفاقھم (تہذیب)

واقدی بالاتفاق ضعیف ہے،

امام ذہبی میزان میں کہتے ہیں،

استقر الاجماع علی وھن الواقدی،

واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع ہوچکا ہے،

علامہ زرقانی مالکی سیرۃ کی سب سے مشرح ومبسوط کتاب شرح مواہب میں غزوۂ بدر کے بیان میں واقدی کی نسبت لکھتے ہیں،

الحافظ المتروک مع سعۃ علمہ (جلد اول صفحہ ۔۔۔ مطبوعہ مصر)

حافظ اور باوجود اپنی وسعت علم کے متروک،

غرض وہ بالاتفاق متروک ہے یعنی چھوڑ دیا گیا ہے، اور اسکی روایت سے پرہیز کیا جاتا ہے اسلیے وہ استناد کے قابل نہیں، ابن سید الناس نے عیون الاثر میں محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر الواقدی دونوں کی توثیق وجرح کے اقوال یکجا کئے ہیں، اور جرح کے جوابات دینا چاہتے ہیں، چنانچہ محمد بن اسحاق کی جرح کے جوابات بہت جوش وخروش سے دئیے ہیں، مگر محمد بن عمر واقدی کی جرح کے جوابات نہ دیسکے، اور شروع ہی میں سپر ڈالدیا کہ

اما الکلام فیہ فکثیر

اس پر اعتراضات بہت زیادہ ہیں،

واقدی کی کتاب کی حیثیت | خود مصنف کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد اوسکی تصنیف کی حیثیت بھی متعین ہو جاتی ہے، ایسے غیر معتبر، دروغگو اور جھوٹے کی روایتوں کے مجموعہ کا کیا درجۂ استناد ہو سکتا ہے، اسی لیے امام شافعی فرماتے ہیں،

کتب الواقدی کلھا کذب — واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ ہیں،

امام دارقطنی فرماتے ہیں،

الضعف یتبین علی حدیثہ — اسکی روایت پر ضعف نمایاں ہے،

واقدی کا طرزِ تصنیف بتا چکا ہوں کہ وہ راویوں کے متعدد ناموں کو یکجا کر کے پورا واقعہ بلکہ پوری کتاب قصہ کی طرح بیان کر دیتا ہے، جس سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خاص خاص روایتیں اوس نے کہاں سے لی ہیں اور اسی لیے اسکی کتابیں غیر معتبر سمجھی جاتی ہیں، اب اسی کتاب المغازی کو لیجئے، جو وان کریمر کے جمع و تحشیہ سے کلکتہ میں چھپی تھی کہ اُس کے شروع میں ایک ہی جگہ اپنے ۲۵ شیوخ کے نام لکھدیئے ہیں، اور کہدیا کہ "ان میں سے بعض کی باتیں بعض میں ملگئی ہیں" اور اس کے بعد بے سند، مسلسل ایک کہانی کی طرح غزوات کے تمام حالات بیان کر دیئے ہیں، کہیں کہیں سند الگ بھی آجاتی ہے مگر منقطع، بہرحال یہ ابتدائی سند بھی صرف اس کے شیوخ کی ہیں، اون کے آگے کے راویوں کا اوس نے کوئی پتہ نہیں دیا ہے، سمجھ لیجئے کہ ایسی روایتوں کے مجموعہ کی محدثین میں کیا وقعت ہو سکتی ہے، اور اسی لیے واقدی کی کتاب المغازی اہل نقد میں کوئی درجہ نہیں رکھتی، چنانچہ امام احمد بن حنبل نے واقدی کی اسی طرزِ تالیف کی بنا پر اوسکی کتاب کو غیر مسلّم ٹھہرایا ہے، (عیون الاثر) ایک جرمن مستشرق

ابن سیّد الناس ہی کو لکھنا چاہیئے تھا — [margin note partly illegible]

عربی واقدی کے ایک طرفدار نے یہ کہا ہے کہ "اگر یہ واقدی کا عیب ہے تو زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے" مگر یہ جواب اسلئے صحیح نہیں کہ زہری اور ابن اسحاق کی شخصیت بجائے خود بلند ہے، اس کے علاوہ ان دونوں نے کہیں کہیں یہ طرز اختیار کیا ہے، پوری کتاب کی تحالت انھوں نے یہ نہیں بنا دی ہے، اور واقدی نے اپنی ذاتی کمزوری، اور بے اعتباری کے ساتھ ساتھ عموماً اپنا یہ وتیرہ اختیار کر لیا، اس سے اوسکی کتاب گر گئی، اور سند کے قابل نہیں رہی، پوری کتاب میں شاذ و نادر ہی اس کے یہاں پوری سند موجود ہے، اگر کہیں کہیں ہے بھی تو کسی

ابتدائی عینی شاہد تک تو وہ پہنچتی ہی نہیں، اور جو پہنچے بھی تو رواۃ ناقابلِ اعتبار، اسلیے اس کتاب کے ایسے واقعات جو دوسری معتبر کتابوں میں موجود نہ ہوں ناقابلِ تسلیم ہیں،

واقعہ کی اصلیت | اب اتنی تمہیدوں کے بعد بدر میں آپ کے ڈر کر بیہوش ہو جانے کی روایت پر غور کیجئے اگر یہ واقعہ بالفرض واقدی کی کتاب المغازی میں ہو بھی تو اوسکی حیثیت کا اندازہ آپ مصنف اور تصنیف کی حیثیت سے لگا چکے ہونگے اور آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ایسے جھوٹے، بے اعتبار، جعلی حدیث بنانے والے کی روایت کا کیا درجہ ہوگا؟ یہ واقعہ واقدی کی جس روایت پر مبنی ہے، واقدی نے اوسکا سلسلۂ سند مطلق نہیں بیان کیا ہے، کہ اس سے کس نے یہ بیان کیا، اور اوس نے کس سے سنا، اور اس کا آخری شریکِ واقعہ عینی گواہ کون ہے، غرض مطلق بے سند بات ہے، اور سیرت اور حدیث کی کس کتاب سے اسکی تصدیق و تائید ہوتی ہے،

بہرحال اس خاص واقعہ کی تحقیق کے سلسلہ میں جب مارگولیتھ صاحب کی کتاب "محمد اور ترقیِ اسلام" (محمد اینڈ دی رائز آف اسلام) اور ولہاؤسن کی "محمد مدینہ میں" کا اقتباس مذکور دیکھا، اور اس کا وان کریمر کے شایع کردہ اصل عربی متن سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس دروغبافی میں بیچارہ واقدی کا اوتنا قصور نہیں جسقدر ولہاؤسن صاحب اور مارگولیتھ صاحب کا ہے، "اول ظلم درجہان اندک بود، ہر کہ آمد برآن مزید کرد" سب سے پہلے آپ مارگولیتھ صاحب کی روایت پڑھیے :-

"جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا، تو پیغمبر اپنے جھونپڑی میں واپس آیا، اور غش کھا گیا، جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنا وقت دعا کے نذر کیا، تا کہ وہ یہ دکھائے کہ وہ بالکل ہوشیار تھا" (صفحہ ۲۵۹)

مارگولیتھ صاحب اپنے اس "اختراعِ فائقہ" کا ماخذ واقدی کے جرمن ترجمہ کو بتاتے ہیں، جسکا مترجم ولہاؤسن ہے، اور جس نے اس کا نام "محمد مدینہ میں" رکھا ہے :-

"جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو محمد کو غش آگیا . . . بہرحال وہ بہت جلد ہوش میں آگئے" (برلن ۱۸۸۲ء صفحہ ۵۰)

اب آیئے اور واقدی کی کتاب المغازی کھولیں، اس میں کیا ہے؟ لفظی ترجمہ یہ ہے،

پھر عتبہ نے اپنے مقابلہ کے لیے (مسلمانوں کو) پکارا، اور رسول اللہ صلعم اپنے عریشہ میں تھے، اور آپکے صحابہ اپنی صفوں میں تھے، تو آپ لیٹ گئے تو آپ کو نیند نے چھالیا، جو آپ پر غالب آگئی تھی، اور فرمایا تم اس وقت تک نہ لڑو، جب تک میں تم کو اجازت نہ دوں، اور اگر وہ تمھارے قریب آجائیں تو ان کو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو جب تک وہ تمپر چھا نہ جائیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! لوگ قریب آگئے، اور انھوں نے ہمسے پا لیا، تو رسول اللہ صلعم بیدار ہوئے، اور خدا نے آپ کو کافروں کو خواب میں تھوڑا کر کے دکھایا اور بعض کو بعض کی آنکھوں میں تھوڑا کر کے دکھایا، تو رسول اللہ بیقرار ہوئے اور دونوں ہاتھ اپنے اٹھائے تھے اپنے رب سے موعودہ نصرت مانگ رہے تھے، (کتاب المغازی واقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء (دان کریمر)

ناظرین! غور کریں، بات کہاں سے کہاں گئی، واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے، ولہاؤسن اس کا ترجمہ غشی کرتے ہیں، مارگولیتھ صاحب ڈر سے غش کھا کر گر جانا (FAINTED) اس سے مطلب نکالتے ہیں، کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟ عربی جاننے والوں کے لیے ہم واقدی کی کتاب کی اصل عبارت نقل کر دیتے ہیں،

"ثم دعا عتبۃ الی المبارزۃ ورسول اللہ صلعم فی العریش واصحابہ علی صفوفھم، فاضطجع فغشیہ نوم غلبہ وقال لا تقاتلوا حتی اوذنکم وان اکثبوکم فارموھم ولا تسلوا السیوف حتی یغشوکم، قال ابوبکر رض یا رسول اللہ قد دنا القوم وقد نالوا منا فاستیقظ رسول اللہ وقد اراھم اللہ ایاھم فی منامہ قلیلا وقلل بعضھم فی اعین بعض ففزع رسول اللہ صلعم وھو رافع یدیہ یناشد ربہ ما وعدہ من النصر"

ہمارے عربی خوان طلبہ غور سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ پڑھ جائیں اور بتائیں کہ اس میں کون لفظ ہے جس کا ترجمہ اوکسفورڈ اور جرمنی کے عربی پروفیسروں نے ڈر کر غش کھا کر گر جانا کیا ہے نہ تو اس میں خون

سے پہلے قطرہ کے گرنے" کا لفظ ہے، نہ اس میں اس موقع پر "باہر سے اندر عریشہ میں آنے کا لفظ" ہے، نہ فوجوں کے باہم مقابل آنے کا لفظ ہے نہ "غش کھانے کا لفظ" ہے، نہ پھر ہوش میں آنے" کا لفظ ہے، کیا مستشرقانہ ژرف نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر دلیل چاہیے؟ کیا یہ علمائے یورپ کے ناطرفدارانہ مطالعۂ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں؟ اور اوکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل وکمال اور بے تعصبی کی عمدہ نمایش نہیں؟

اب میں بتاتا ہوں کہ ان فضلائے روزگار کی غلطی کا کیا منشا ہے؟ واقدی نے اس موقع پر غشیہ نوم غلبہ (نیند آپ پر چھا گئی جو آپ پر غالب آگئی تھی) غشی کا لفظ اس میں ہے، جس کے معنی عربی میں چھا جانے کے ہیں جیسے قرآن مجید میں ہے،

واللیل اذا یغشی — قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے،

اوکسفورڈ اور جرمنی کے فاضلوں نے غشی کو غشی اور بیہوشی سمجھا حالانکہ عربی کا ایک معمولی طالب العلم یہ جانتا ہے کہ جب غشی اور بیہوشی کے معنی اس لفظ سے ادا کرنا چاہیں گے تو باب افعال کا صیغہ مجہول استعمال کیا جائیگا، یعنی اُغشی، پھر جب اس میں مجرد ثلاثی کے فعل معروف کے ساتھ غشیہ موجود ہے، اس کے بعد اس کا فاعل لفظ نوم (نیند) موجود ہے اسکے بعد استیقظ، نیند سے بیدار ہونا موجود ہے، پھر خواب کا دیکھنا مذکور ہے، تو پھر اس موقع پر سو جانے کے بجائے غش کھانا ترجمہ کرنا کس درجہ نادانی اور جہالت ہے، اسی کے ساتھ سونے کے وقت جنگ کا نقشہ اور تدبیر بھی آپ بتا رہے ہیں کیا کوئی ایسی اختیاری غشی بھی ممکن ہے، جسکو تھوڑی دیر روکے کوئی جنگ کی اہم بحث کا فیصلہ بھی کرتا جائے،

نیند کے چھانے کا محاورہ قرآن میں اسی موقع پر آیا ہے،

اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنْہُ (انفال) — یاد کرو جب خدا اپنے امن سے تمپر نیند کو چھا رہا تھا،

کیا یہاں بھی ترجمہ "بیہوش کر رہا تھا" مناسب ہوگا؟

اب رہی واقدی کی اصل روایت یعنی اس وقت آنحضرت صلعم کے سونے اور بیدار ہونے اور خواب میں

فوج کو کم تعداد میں دیکھنے کی روایت تو یہ سرتا پا لغو ہے، اس موقع پر کے تمام واقعات احادیث اور معتبر کتب مغازی میں مذکور ہیں، لیکن اس موقع پر تو نیند، بیداری اور خواب کا مطلق ذکر نہیں، بلکہ اس وقت بیداری اور عالم [illegible] کا بیان بتصریح ہے، یہ مشہور و معروف واقعہ کہ جب عتبہ نے مبارزت طلب کی تو پہلے تین انصاری جوان مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا، اور چلا کر کہا کہ محمد یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں، ہمکو اپنے برادر عم زاد سے غرض ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ گئے، اور آپ نے حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ اپنے عزیزوں کو بھیجا، کہاں یہ واقعہ اور کہاں واقدی کا یہ بیان کہ عتبہ نے مبارزت طلب کی، آنحضرت صلعم پر اس وقت نیند چھائی جا رہی تھی، آپ سو گئے، اور پھر خواب دیکھا، اور حضرت ابو بکرؓ کے پکارنے سے پھر اٹھے؛

ابو داؤد میں اس واقعہ کی اصلی صورت موجود ہے،

عن الساعدی قال النبی صلعم یوم بدر اذا	ساعدی سے روایت ہے کہ آپ نے بدر کے دن فرمایا جب قریش تمھارے قریب آجائیں
اکثبوکم فارموھم بالنبل ولا تسلوا السیوف	تو انکو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو جب تک وہ تم کو چھا نہ لیں،
حتی یغشاکم[1] (کتاب الجہاد باب فی سل السیوف)	" " " " " " " "
عن علی قال تقدم یعنی عتبة بن ربیعة	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ یعنی عتبہ آگے بڑھا، اور اس کے پیچھے
وتبعه ابنه واخوه فنادی من یبارز فانتدب	اس کا بیٹا اور اسکا بھائی آیا، اور عتبہ نے پکارا کہ کون مقابل آتا ہے؛ تو چند انصاری
له شباب من الانصار فقال من انتم فاخبروه	نوجوانوں نے ان کا جواب دیا، اس نے پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے بتایا،
فقال لا حاجة لنا فیکم انما اردنا بنی عمنا فقال	اس نے کہا، ہمکو تمھاری ضرورت نہیں ہمکو اپنے چچا زاد بھائی چاہئیں، رسول اللہ
رسول اللہ صلعم قم یا حمزة قم یا علی قم یا عبیدة (ایضاً)	صلعم نے فرمایا اے علی تم اٹھو، اے حمزہ تم اٹھو، اے حارث تم اٹھو،

کیا یہ کسی بزدل بیہوش کے کام ہیں، پھر خود آنحضرت صلعم نے اپنے ہاتھ میں تیر لیکر مسلمانوں کی صفوں کو

[1] اسی معنی کی روایت صحیح بخاری جلد ۲ غزوۂ بدر میں بھی ہے،

درست کیا، اور ان کو برابر کیا، کیا یہ کسی بزدل اور بیہوش کا کام ہے؟ بدر کے بعد حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے بہادر شخص وہ سمجھا جاتا تھا جو لڑائی میں آپ کے برابر کھڑا ہوتا تھا، کیا یہ کسی بزدل و بیہوش کا کام ہے؟ احد میں جب اکثروں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، کون حملوں کا نشانہ تھا، اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا؟ محمد رسول اللہ صلعم؛ کیا یہ کسی بزدل کا کام ہے؟ حنین میں جب دس ہزار صحابہ نے تھوڑی دیر کے لیے قدم پیچھے ہٹائے، تو پہاڑ کی طرح کون اپنی جگہ پر جا رہا؟ محمد رسول اللہ صلعم! ایک غزوہ کی واپسی میں ایک منزل پر دوپہر کو جب تمام صحابہ مختلف درختوں کے سایہ میں آرام کر رہے تھے اور ایک بدوی آپ ہی کی تلوار بے نیام کرکے آگے بڑھا، اور آپ سوتے سے جاگ پڑے، اور اس نے پوچھا کہ اے محمد، تم کو اب کون مجھ سے بچا سکتا ہے، آپنے جواب دیا اللہ! اور اسنے یہ معجزانہ سکون اور طمانیت دیکھکر تلوار نیام میں کر لی، تو یہ کارنامہ کسی بزدل کا ہے؟ یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ کسی کے خون سے رنگین نہیں کیا، یہ پیغمبرانہ پاکی تھی، مگر یہ قلب کے ضعف اور دل کی کمزوری کی علامت نہیں؛

واقدی نے یہ روایت بنا کر حقیقت میں قرآن مجید کی اس آیت پاک کی تفسیر کرنی چاہی ہے جو واقعہ بدر کے تعلق سے نازل ہوئی،

اِذْ یُرِیْکَھُمُ اللّٰہُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا وَلَوْ اَرٰکَھُمْ	یاد کر جب خدا نے تجھکو تیری نیند میں ان لوگوں کو تھوڑا کرکے دکھایا، اور اگر
کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ (انفال)	ان کو زیادہ کرکے تجھے دکھاتا، تو تم سست ہو جاتے اور لڑائی کے فیصلہ میں باہم اختلاف کر لیتے

واقدی نے اپنی جہالت سے اس خواب کا موقع عین معرکہ کا وقت سمجھکر اس معجزانہ خواب کی روایت تیار کر لی، حالانکہ خود اسی آیت میں یہ موجود ہے کہ لڑائی کے متعلق فیصلہ ہو جانے سے پہلے ہی آنحضرت کو یہ تمثیلی خواب دکھایا گیا تھا، جس میں انکی تعداد کی کثرت کو نتیجہ کے لحاظ سے کم تعداد کرکے دکھایا گیا تھا یعنی قریش کی شکست کی یہ پیشگوئی عالم رؤیا میں دکھائی گئی تھی،

پروفیسر مارگولیتھ صاحب نے اسی "فرضی واقعۂ بیہوشی" کے تذکرہ سے پہلے آنحضرت صلعم کی کمزوری کے ثبوت میں ایک دو اور بے جوڑ باتوں کی تمہید کی ہے، وہ بھی سرتا پا لغو ہیں، پروفیسر صاحب کو واقعات

کے بگاڑنے، واقعات کی غلط ترتیب دینے، اور اچھی سے اچھی بات کو بدنما صورت میں دکھانے میں ید طولیٰ حاصل ہے، جسکے لیے وہ عقل کے علاوہ صرف و نحو و ادب و لغت ہر فن کا گناہ کرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں، چنانچہ اسکی بدترین مثال ان کی کتاب کے صفحہ ۰ میں ہے، کہ:-

"محمد خدیجہ کے ساتھ اکثر ہر رات کو سونے سے پہلے ایک خانگی عبادت ایک دیبی کی تعظیم میں کیا کرتے تھے"

موصوف نے اسکے لیے مسند جلد ۴ صفحہ ۲۲۲ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ مسند کی روایت محولہ میں بالکل اس کے خلاف واقعہ درج ہے، اور آنحضرت صلعم اور حضرت خدیجہ کا نہیں بلکہ اہل عرب کا یہ دستور مذکور ہے کہ وہ عزیٰ کی پوجا کر کے سویا کرتے تھے، چنانچہ عربی جاننے والے کے لیے اصل روایت لکھی جاتی ہے،

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی	حضرت خدیجہؓ کے ایک ہمسایہ نے مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کو
صلعم وھو یقول لخدیجة ای خدیجة واللہ	سنا کہ وہ حضرت خدیجہؓ سے فرما رہے تھے کہ اے خدیجہ خدا کی قسم میں لات و عزیٰ کی پرستش
لا اعبد اللات والعزیٰ واللہ لا اعبد ابدا	نہیں کرونگا، خدا کی قسم نہیں کرونگا، حضرت خدیجہ کہتی تھیں لات کو جانے دیجئے
قال فتقول خدیجة خل اللات خل العزیٰ	عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) راوی کہتا ہے کہ یہ
قال کانت صنمهم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون	قریش کا وہ بت تھا جسکو وہ پوجتے تھے پھر لیٹتے تھے،

اللہ اکبر کتنی بڑی تحریف ہے، ایک معمولی عربی کا واقف سمجھ سکتا ہے، صنمهم اور کانوا یعبدون، اور یضطجعون میں جمع کی ضمیر ہے، جو اہل عرب اور قریش کی طرف پھرتی ہے، اور "وہ دو" یعنی (محمد صلعم اور حضرت خدیجہؓ) کی طرف نہیں پھر سکتی، انھوں نے بجائے عربی کے شاید انگریزی قاعدہ کے مطابق جمع کی ضمیر تثنیہ کی طرف پھیر کر ایک ایسی بات لکھی جو علمائے یورپ کے فضل و کمال کے دامن پر ہمیشہ داغ رہے گا،

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

افسوس کہ معارف کے مختصر صفحات اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں رکھتے اس کے لیے سیرت کی پانچوین جلد کا جو خاص اسی موضوع پر ہو گی ناظرین کو انتظار کرنا چاہیئے،

مساحتِ ذہنی

از جناب ظفر حسین خانصاحب سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس فتحپور

آج کل کے جدید دریافت شدہ مسائل میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے، جسکی تعبیر مساحت ذہنی کے نام سے کیگئی ہے، اور جس کو فنِ تعلیم کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، ہمارے دوست ظفر حسین خانصاحب سب ڈپٹی مدارس فتحپور، اپنی فلسفیانہ افتاد طبع کے ساتھ ساتھ اپنے منصب کے لحاظ سے بھی پچھلی ششماہی میں اسی جدید نظریہ کے مطالعہ و تحقیق میں معروف رہے، اور جسکا نتیجہ یہ اوراق ہیں جو آج ناظرین کے سامنے ہیں،

"معارف"

انسانی سیرت و باطن کا انکشاف، انسان کا ہمیشہ ہمیشہ کا مشغلہ ہے، اس معمہ کے حل کرنے میں اوسنے اپنی دھن میں، دور و نزدیک، ممکن و غیر ممکن، متعلق و غیر متعلق، ہر قسم و ہر قبیل کے وسائل و ذرائع استعمال کئے ہیں، سیاروں کی چال، کف دست کے خطوط، چہرہ کی ساخت، سر کی بناوٹ، رفتار گفتار غرضکہ جہاں سے ہو سکا اس نے اپنے مدعا کی لم لینے کی کاوش کی ہے، لیکن بالآخر یہ تمام کوششیں "اہل تدبیر کی واماندگیاں" ثابت ہو کر رہیں،

نشاۃ جدیدہ کے برکات میں سے ایک برکت یہ ہے کہ نفسیات جو دو ہزار برس سے زائد، مابعد الطبیعات کا "جزو لاینفک" بنا چلا آرہا تھا، ایک مستقل سائنس کے پیرایہ میں نمودار ہوا، اور ماہر نفسیات نے اپنی آرام کرسی دار الاختیار کی مشقت طلب میز سے، تبدیل کی، یہ، گویا، اسرار سیرت کی واکشائی کے حق میں فال نیک تھی، نفسیات کے مدارج ترقی کی تاریخ کہ کس طرح وہ محض علم نظری سے مفید علم عملی بنا اور پھر کس طرح عام خصوصیات نفس کے کلیات دریافت کرنے بعد مختلف افراد کے مختلف مزاجوں کی سراغ رسانی میں، کارآمد ثابت ہو کر انسانے

علم قیافہ، اور علم کاسہ سر وغیرہ کے نام نہاد علوم کو علمی حیثیت سے بیدخل کیا، بیشک ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے
لیکن چونکہ ہمارے موجودہ موضوعِ بحث سے غیر متعلق ہے، اس لیے قلم انداز کیا جاتا ہے، یہاں بحث مقدمہ سیرت
شناس کے اس آخری فیصلہ سے ہے جس کا اصطلاحی نام "مساحت ذہن" ہے،

یورپ اور امریکہ میں "مساحت ذہنی" کے اغراض حسب ذیل ہیں،

(۱) طلبار کی ذہانت کے مختلف مدارج دریافت کرنا، تاکہ ذکی و غبی طلبا کی دفعہ بندی علٰحدہ علٰحدہ ہو سکے اور بلید الذہن طلبا کی سست رفتاری کی وجہ سے تیز طبع بچوں کا ہرج نہ ہو،

(۲) طلبا کا میلانِ طبع معلوم کرنا اور ان کے مناسب حال طریقِ تعلیم تجویز کرنا،

(۳) طلبار اور بالغ العمر اشخاص کے قوائے ذہنیہ کا تناسب دریافت کرنا،

(۴) طلبار اور بالغ العمر اشخاص کے غالب و مغلوب جذبات کا تخمینہ کرنا،

(۵) مختلف پیشوں کے لیے معمول کی موزونیت کا اندازہ کرنا،

(۶) معمول کے اخلاق و مزاج کا پتہ لگانا،

مذکورہ بالا اغراض حاصل کرنے کے لیے، مساحت ذہنی کے متداول نظام یہ ہیں،

(۱) انفرادی مساحتِ ذہنی، جس میں فرداً فرداً معمول کا امتحان لیا جاتا ہے، اس میں تنہائی کی سخت تاکید ہے، عامل و معمول کے علاوہ تیسرے شخص کی موجودگی ممنوع ہے، حتیٰ کہ امتحان کا کمرہ بھی نہایت سادہ وضع کا ہونا چاہیئے تاکہ معمول کا دھیان نہ بٹے،

(۲) عملی مساحتِ ذہنی، جس میں معمول اپنے ہاتھ سے کچھ آزمایشین حل کرتا ہے،

(۳) اجتماعی مساحتِ ذہنی، جس کے ذریعہ سے متعدد افراد کی ایک وقت میں جانچ کیجا سکتی ہے،

(۴) جذبی و مزاجی مساحت ذہنی، جس میں کسی پیشہ کے لیے معمول کی صلاحیت اور اس کے مزاج کی حقیقت کی پڑتال کیجاتی ہے،

(۵) درسی مساحتِ ذہنی، جس میں نصابِ تعلیم کے مختلف مضامین کے ذریعہ سے مساحتِ ذہنی کیجاتی ہے
متذکرۂ بالا انتظامات سے، اگر ہر ایک سے بالاستیعاب بحث کیجائے، تو ہر نظام اپنے لیے ایک مستقل ضخیم رسالہ کا طالب ہوگا، اس مختصر مضمون میں محض ان کی روشناسی ممکن ہے اور سردست یہی مقصود ہے

(۱) انفرادی مساحتِ ذہنی،

مساحت ذہنی کو، ایک مستقل فن بنا دینے کا شرف، فرانس کے ایک ماہر نفسیات مسمی بہ الفرڈ بنے (BiNET) کو حاصل ہے، حکومت فرانس کی جانب سے یہ اس کار خاص پر مامور ہوا تھا کہ غبی اور ذہین طلبہ کے مدرسہ میں داخلہ کے وقت، ذہنی قابلیت کے اندازہ کا کوئی طریقہ نکالے، تاکہ کند ذہن طلبا کی سست رفتاری کی وجہ سے، تیز بچوں کا ہرج واقع نہ ہو اور جو عام غبی طلبار درسی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہیں ان کو ابتدا ہی سے ان کے مناسب حال مشاغل میں لگایا جائے، جس میں وہ ترقی کرسکیں اور اپنی لائن میں ملک کے مفید فرد بن سکیں، اس طرح حکومت بے نتیجہ صرف خطیر سے بچ جائے گی اور ملک کے بچوں کا فضول وقت بھی ضائع نہ ہوگا،

چنانچہ اس تقریب سے ۱۹۰۵ء میں بنے نے ذہنی پیمائش کا سب سے پہلا پیمانہ تیار کیا، ۱۹۰۸ء میں اس پر نظر ثانی کی اور ۱۹۱۱ء میں مزید اصلاح کی، حتیٰ کہ ۱۹۱۳ء میں، جب وہ مرا ہے، اپنا آخری "پیمانہ عقل" ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد شائع کرنے والا تھا،

یہ ظاہر ہے کہ کسی متعلم کی نفسی کیفیت پر نسبتہً قطعی اطلاع پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک ماہر نفسیات، اپنی نگرانی تعلیم میں اس متعلم کا "مطالعہ" کرے یعنی اس کے ذہنی رجحانات، طبعی میلانات، مختلف مضامین درسیہ میں اس کی ترقی و عدم ترقی اور ان کے اسباب پر بغور نظر کرے اور اپنے مشاہدات سے تشخیصی نتائج اخذ کرے، لیکن یہ عمل ایک طویل وقت چاہتا ہے اور صحیح معنی میں ماہر نفسیات معلم، ابتدائی درسگاہوں کا عنقا ہے، لہذا کیوں نہ عقل کے تخمینہ کا کوئی ایسا آلہ تیار کیا جائے جو قلیل وقت میں متعلم کی ذہنی حالت کو

آئینہ کردے، اور جس کو معلمین مبادیِ نفسیات سے واقف ہونے کے بعد استعمال کرسکیں؟ یہ سوال فن پیمائش عقل کی تدوین کی بنیادی خواہش تھی،

انفرادی مساحت ذہنی کا پیمانہ سہ سالہ بچہ سے لیکر بالغ العمر انسان تک کی عقل کی پیمائش کے لئے وضع کیا گیا ہے مثال کے طور پر جستہ جستہ آزمایشیں جو مختلف سن کے بچوں کے لئے موزوں ہیں نقل کیجاتی ہیں،

زیر بحث پیمانہ، ایجوکیشنل کمشنر، حکومت ہند کی جانب سے بنے کر اصول پر شائع ہوا ہے جو ہر صوبہ کے مقامی حالات کے لیے موزوں نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ اس ملک میں جسطرح ناپ تول کے پیمانہ جدا جدا ہیں اسی طرح ہر صوبہ کی عقل کا پیمانہ بھی علیحدہ ہونا چاہیئے، چنانچہ راقم الحروف نے اپنے صوبہ کے مقامی حالات کے لحاظ سے سوالوں میں جابجا ترمیم کردی ہے، اور تبصرہ میں آزمایش کی نفسیاتی تنقید کی ہے، اخیر میں اپنے تجربات ختم کردیئے ہیں،

عمر آٹھ سال،

آزمایش اول،

۲۰ سے ایک تک الٹی گنتی گننا

عمل۔ معمول سے کہو، "کیا تم الٹی گنتی گن سکتے ہو؟ اچھا بیس سے ایک تک الٹی گنتی گن تو جاؤ، اسطرح ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ہاں آگے چلو"

ہدایت۔ اگر بچہ ہراساں ہو تو اس کی ہمت افزائی کرو، ہمیشہ اوپر کے اعداد کی مثالیں جیسے ۲۳، ۲۲، ۲۱ جلدی نہ کرو، غلطی پر معمول کو ٹوکو نہیں،

تخمینہ۔ اگر ۴۰ سکنڈ میں معمول ۲۰ سے ایک تک الٹی گنتی گن جائے اور ایک سے زائد غلطی نہ کرے تو اسے کامیاب سمجھو جو غلطیاں معمول خود صحیح کرے، انھیں غلطیاں شمار نہ کرو،

تبصرہ۔ اس عمل میں دو ذہنی قوتیں مشتمل ہیں، ایک مسلسل توجہ قائم رکھنے کی قوت، دوسری عادت سے

کے خلاف عمل کرنے کی قدرت، یہ دونوں قوتیں ذہانت کے ضروری اجزا ہیں، احمق اور مجانین کسی شے پر مقررہ اصول کے ماتحت اپنی توجہ قائم نہیں رکھ سکتے اور حیوانات کی طرح جدید حالات کے مطابق اپنے قدیم طرز عمل کو تبدیل نہیں کرسکتے، اس آزمائش سے بچوں کی ذہنی تکان کا بھی اندازہ کرسکتے ہو، بعض بچے، دس تک الٹی گنتی گن کر پھر سیدھی گننے لگتے ہیں، بعض اس سے زائد گن سکتے ہیں اور بعض چار پانچ ہندسوں سے زائد آگے نہیں بڑھ سکتے، چنانچہ اس طور پر ان کی حد نگاہ نہ توجہ کے ظرف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور ریاضی کے اصول سے ان کی توجہ کا جذر نکالا جاسکتا ہے،

تجربہ۔ ۴۰ سکنڈ کی مدت کم معلوم ہوتی ہے، اس صوبہ کے لیے، شہری طلبا کے لیے ۳۰ اور دیہاتی طلبا کے لیے ۴۰ سکنڈ ہونا چاہئیں، اس عمر کے لیے یہ آزمایش موزوں ہے،

آزمایش دوم

دو چیزوں میں امتیاز کرنا،

عمل۔ بتاؤ۔ دودھ اور پانی میں کیا فرق ہے، اگر معمول نہ سمجھے تو کہو، تم دودھ کو جانتے ہو یا نہیں اور پانی کو بھی جانتے ہو، اچھا تو بتاؤ "دودھ اور پانی میں کیا فرق ہے"؟ اسی طرح پوچھو کہ پتھر اور انڈے میں کیا فرق ہے، لکڑی اور شیشہ میں کیا فرق ہے؟

ہدایت۔ اشارتی سوالات سے پرہیز کرو، لڑکے کا جواب اگر واضح نہ ہو تو سوال کرکے اسے صاف کراؤ

تخمینہ۔ اگر تین سوالوں میں سے دو کا جواب صحیح ہے تو لڑکا پاس ہے، صحیح صحیح منطقی تفریق کی طلبا سے توقع نہ کرو،

تبصرہ۔ قوت امتیاز عقل کا مخصوص جوہر ہے، نفسی ارتقا کے رو سے بچہ میں اول تفریق کی قوت پیدا ہوتی ہے اس کے بعد دو یا دو سے زائد چیزوں میں قدر مشترک معلوم کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے، اسلیے دو یا زائد چیزوں کے مابہ الاشتراک تہائی کے سوالات آئندہ عمروں کے لیے وضع کیے گئے ہیں،

تجربہ۔ طلباء کے سوالات کو نوٹ کرنا اور ان کی نوعیت پر غور کرنا چاہئے، ان جوابات سے ان کی نفسی حالت کا پتہ چلے گا، اکثر دیہاتی بچوں کی جانب سے جو ادنی طبقہ کے گھرانوں سے مدرسہ میں آتے تھے، مجھے یہ جواب ملا ہے کہ "صاحب دودہ اُجل ہوت ہے اور پانی میلونس" (یعنی دودھ سفید ہوتا ہے اور پانی اسکے مقابلہ میں میلا) لیکن انھوں نے اپنی "اجل اور ملیونس" کی منطق باقی دو سوالوں میں بھی چلائی یعنی انڈے اور تپھر اور لکڑی اور شیشہ کے درمیان بھی ان کے نزدیک یہی فرق تھا، دیہاتی بچوں کے لیے اس عمر میں یہ سوال موزوں نہیں، ۹ برس کے بچوں کے لیے میں نے اسے موزوں پایا، شہری بچے کیلئے موزوں ہے،

آزمایش سوم

معاملہ فہمی،

عمل، (۱) اگر مدرسہ آتے ہوئے راستہ میں تمھیں معلوم ہو کہ دیر ہو گئی ہے تو کیا کر دگے،

(۲) اگر تمھارے پاس سے کسی اور لڑکے کا قلم کھو جائے تو تم کیا کر دگے،

(۳) اگر کسی لڑکے کے ہاتھ سے تمھارے چوٹ لگجائے، جان کر نہیں، ویسے ہی تو تم کیا کر دگے،

ہدایت:۔ ہر سوال کا جواب ۲۰ سکنڈ میں ملنا چاہیئے، ضرورت ہو تو سوال کا اعادہ کرو، لیکن سوال کی عبارت میں فرق نہ ہو، عموماً یا تو جواب فوراً ملے گا یا بالکل نہیں ملے گا،

تخمینہ۔ دو جواب صحیح ہونا چاہئیں،

تبصرہ، اس آزمایش سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ معمول میں فرضی معاملات تصور کرنے اور ان کی نسبت فیصلہ کرنے کی قوت کہاں تک ہے، یہ گویا قوت تخئیل اور قوت فیصلہ کا امتحان ہے جو بعض ماہر نفسیات کے نزدیک، دانشمندی کا مایۂ خمیر ہیں،

تجربہ۔ پہلے سوال کا جواب مجھے ۸۰ فیصدی کے قریب ابتک غلط ملے ہیں، اس سے اسکی نا موزونیت کا پتہ چلتا ہے، اس کا جواب یا تو یہ ملا کہ گھر لپٹ جائیں گے یا کچھ نہیں ملا، وجہ یہ ہے کہ پابندی وقت کا احساس

ملک میں مفقود ہے، میرے خیال میں جبتک جبری تعلیم جاری نہ ہو جائے اس وقت تک اس قبیل کے سوالات کو ملتوی رکھا جائے،

آزمائش چہارم

تعریفات

عمل، کرسی کسے کہتے ہیں، تصویر کسے کہتے ہیں، سیاہی کسے کہتے ہیں، دکان کسے کہتے ہیں،

ہدایت، امداد ممنوع،

تخمینہ، دو جواب صحیح ہونا چاہئیں،

تبصرہ، نفس انسانی اور حیوانی میں مابہ الامتیاز صرف یہ امر ہے کہ اول الذکر، تجرید تصورات و اخذ کلیات پر قادر ہے اور حیوان نہیں، یہ امتحان اسی قوت کے ابتدائی مدارج کا پیمانہ ہے، اسی سے بچہ کے شعور کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے، جوابات کی نوعیت پر غور کرنا چاہیئے، بعض بچے ان چیزوں کی شکل کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور بعض ان کے اجزاء کے نام لیکر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بعض اپنے سن وسال اور محدود معلومات کے مطابق خاصی جنس وفصل تلاش کرنے اور بتانے کی کوشش کرتے ہیں،

تجربہ، اس میں شک نہیں کہ اس آزمائش میں زبان کے مشکلات لاحق ہیں، بہت سے معمول اپنے صحیح خیالات کو بیان کرنے پر قادر نہیں لیکن، میرے خیال میں قوت گویائی بجائے خود ذہانت کی ایک دلیل ہے، باتونی بچے اکثر بڑے ذہین بھی ہوتے ہیں، اسلیے کہ زبان پر قدرت، ایک خاص حد و قسم کی نفسی ترقی کو مستلزم ہے،

آزمایش پنجم،

پانچ ہندسوں کا اعادہ،

عمل، معمول سے کہو، وہ غور سے سنے اور جو تم کہو اُسے دہرائے، اس کے بعد حسب ذیل اعداد کا

سلسلہ ایک ایک کر کے اسے سناؤ، ہر سلسلہ آہستہ آہستہ اور صاف صاف سنایا جائے، لہجہ اور وقت میں اختلاف نہ ہو، یعنی تقریباً دو سکنڈ کی رفتار سے اعداد بولے جائیں اور لہجہ میں موسیقیت پیدا نہ ہونے پائے،

۳، ۱، ۷، ۵، ۹ - ۴، ۲، ۳، ۲، ۸، ۵-۹، ۸، ۱۱، ۷، ۱، ۶

ہدایت، معمول کو اعداد کی تعداد نہ بتانا چاہیئے لیکن ہر سلسلۂ اعداد کو سنانے سے قبل، اس کی توجہ مائل کر لینا شرط ہے، جب بچہ اعادہ کر رہا ہو اس کی جانب نہ دیکھو،

تخمینہ، ایک سلسلہ کا صحیح ہونا کافی ہے،

تبصرہ، یہ دراصل صوتی ائتلافاتِ ذہنی کے بنا پر حافظہ کی قوت کا امتحان ہے، احمق اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتے،

تجربہ، اس سن کے لیے موزوں ہے، میرے تجربہ کا فی صدی اوسط امید افزا ہے،

عمر بارہ سال

آزمائش اول،

غیر مرتب، جملے،

سامان، تین کارڈوں پر علیحدہ علیحدہ حسب ذیل جملے تحریر ہیں،

(۱) شہر روانہ ہم کو ہوئے علی الصباح،

(۲) سے استاد کھانے مین اپنے لیے اصلاح کی کاپی،

(۳) ہے کتا آقا حفاظت کی کرتا وفادار،

عمل، معمول کو ایک کارڈ دیکر اس سے کہو "دیکھو اس کارڈ پر ایک جملہ لکھا ہوا ہے مگر اس کے لفظ الٹ پلٹ گئے ہیں اور اسلیے مطلب سمجھ میں نہیں آتا، ان لفظوں کو ٹھیک کر کے ایک عمدہ سا جملہ تو بناؤ، جس کے معنی سب سمجھ سکیں" یہی عمل دیگر کارڈ ونکے ساتھ کرو، ہر جملہ کے لیے ایک منٹ دو،

ہدایت، جواب لینے میں عجلت نہ کرو، اگر معمول کامیاب نہ ہو تو اس جملہ کو صحیح پڑھ کے سنا دو اور ہر لفظ کی طرف اشارہ کرتے جاؤ، تنقید و توضیح بالکل نہ کرو،

تخمینہ، دو جملے صحیح ہونا چاہئیں، اگر کسی جملہ میں کوئی لفظ رہجائے یا بدل جائے تو اسے صحیح نہیں شمار کیا جا سکتا، اگر جملہ معنی خیز ہو خواہ ترکیب اس کی غلط ہو تو آدھے نمبر دیئے جا سکتے ہیں،

تبصرہ، اکثر محققین کی رائے میں ذہانت کا یہ بہترین امتحان ہے اسلیے کہ معمول اپنی ذہانت کے وسیلہ سے مہمل عبارت میں ایسے اشارات تلاش کرتا ہے جن کی مدد سے معنی خیز جملہ بن سکے،

تجربہ، معمول جس وقت تک یہ امر اچھی طرح نہ سمجھے کہ اسے کیا کرنا ہے، آزمائش بے سود ہے، اسلیے اولاً نمونہ کے طور پر دو جملے درست کر کے اسے آزمائش کا منشا سمجھا دینا ضروری ہے،

آزمائش دوم

استدلال

معمول کو ایک پرچہ کو جس پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوتی ہے کہو کہ وہ اُسے پڑھکر جواب دے،

"میں مدرسہ روانہ ہو کر سو گز چلا،

پھر داہنی جانب موڑ کر پچاس گز گیا،

پھر داہنی جانب موڑا اور سو گز چلا،

تو بتاؤ کہ میں اسکول سے کتنے دور چلا آیا،

ہدایت: معمول سے عبارت باواز بلند پڑھواؤ اور حل دل میں کرنے دو، کسی طرح کی امداد نہ دو، اگر پہلی بار کامیاب نہ ہو تو دوبارہ کوشش کرنے کا موقع دو،

تخمینہ، اگر دوبارہ لڑکا صحیح بتائے تو آدھے نمبر دیئے جا سکتے ہیں، صحیح جواب عبارت پڑھنے کے بعد ایک منٹ کے اندر مل جانا چاہیئے،

تبصرہ۔ اس قبیل کے سوال کرنے میں معمول کو تخیل، تقابل اور ترتیب مقدمات اور استنباط سے کام لینا پڑتا ہے جو ذہانت کے اربعہ عناصر ہیں،

تجربہ۔ اس عمر کے لیے موزون ہے، دو سوال اسی قبیل کے اور ہونا چاہئیں،

آزمائش سوم

تصویر فہمی

سامان۔ چار مختلف تصویریں،

عمل۔ پہلی تصویر لڑکے کو دکھاکر، تصویر کا منشا دریافت کرو،

ہدایت۔ اگر جواب مختصر ہو تو کہو، "اپنا مطلب صاف صاف بیان کرو" دورانِ امتحان میں معمول کے جواب کی نسبت اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرو،

تخمینہ۔ تین تصویروں کا مطلب صحیح بتانا چاہیئے،

تبصرہ۔ تصویر کے امتحان کے تین درجے ہیں، تین سال کے بچون سے صرف یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ کس شے کی تصویر ہے مقصود یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اشیا و اسمار کا تعلق کہان تک مرکوز ہو چکا ہے دوسرے درجہ پر تصویر کا بیان پوچھا جاتا ہے، یہ چھٹے سال کے لیے مخصوص ہے، لیکن تصویر کا مفہوم یا منشا ۱۲ سال سے قبل کبھی نہ پوچھنا چاہیئے، راقم الحروف اس عمر میں اکثر کارٹونوں کا منشا سمجھنے سے عاجز رہے،

تجربہ۔ طلبا اس آزمائش میں کمال دلچسپی لیتے ہیں،

آزمائش چہارم

الفاظ کا جملون میں استعمال،

عمل:۔ دیکھو میں تین لفظ لیتا ہوں، اور ایک جملہ بناؤں گا جس میں یہ تینوں لفظ کھپ جائیں گے یہ تین الفاظ یہ ہیں:۔ پرند، درخت، اور گھونسلہ، ان تینوں لفظوں سے میں یہ جملہ بناتا ہوں، "پرند

درخت میں گھونسلہ لگاتے ہیں" اب میں تمھیں بھی تین لفظ دیتا ہوں، تم بھی ایک جملہ بناؤ جس میں یہ تینوں لفظ آجائیں لڑکے، گیند، دریا،

اس کے بعد اسی طرح یہ دو سوال دو،

(۲) کام، روپیہ، آدمی،

(۳) سڑک، بازار، باغ،

ہدایت۔ اگر معمول یہ سمجھتا ہو کہ جملہ میں ان تین لفظون کے علاوہ چوتھا لفظ نہ آئے تو اُسے اچھی طرح سمجھا دو کہ یہ تین لفظ دیگر الفاظ کے ساتھ استعمال کئے جائیں، ایک منٹ میں جواب نہ ملنے پر، دوسرا سوال بولو، ہر سوال ایک بار حل کرنے کی کوشش کا موقع دو،

تخمینہ:۔ دو جواب صحیح ہونا چاہئیں، صحت جواب کا معیار یہ ہے کہ جواب مفرد جملوں میں ہو، اگر دو جملوں میں بھی ہو، تو دو تصورات سے زائد اس میں نہ آنے پائیں، مثلاً یہ جواب غلط ہوگا، لڑکے کی گیند کھو گئی، اور ہم دریا گئے" اسی کے ساتھ جملہ مہمل نہ ہونا چاہیئے، جیسے لڑکے کے پاس ایک گیند اور ایک دریا ہے واحد، جمع یا الفاظ کے صرفی تغیرات میں طلبا کو آزادی دینا چاہیئے،

تبصرہ۔ حماقت کی نمایاں خصوصیت، ائتلافات ذہنی کی کمی ہے، یہ آزمائش اس کمزوری کو آشکار کر دیتی ہے،

دیہاتی مدارس کے اس عمر کے طلبا کی کامیابی کا اوسط فیصدی امید افزا نہیں ہے، زیادہ عمر کے طلبا پر تجربہ نہیں کیا گیا، اسلیے اسکی موزونیت کے متعلق کوئی قطعی رائے ابھی نہیں دیجا سکتی،

آزمائش پنجم،

پانچ اعداد کا اعادہ معکوس

عمل۔ جو عدد ہم تمھیں سنائیں گے ان کو الٹا دہرانا، جیسے اگر ہم کہیں ۱-۲-۳، تو تم کہو گے ۳-

۱۱-۲ ، ۳، ۱۱، ۸، ۷، ۹ - ۶، ۷، ۹، ۴، ۱، ۸، ۲ - ۱، ۷، ۶، ۹، ۲، ۱، ۵،

ہدایت، سلسلۂ اعداد کا دہرانا ممنوع ہے، اس وقت تک اعداد نہ سناؤ جبتک معمول اچھی طرح تمھارا منشا نہ سمجھ لے، اگر معمول سیدھا اعادہ شروع کرے تو اسے ٹوک دو، اور الٹا اعادہ کرنے کو کہو ہر سلسلہ سنانے سے قبل معمول سے بغور سننے کی فہائش کرو،

تخمینہ، ایک سلسلہ صحیح ہونا کافی ہے،

تبصرہ، اعادہ معکوس، غائر توجہ کا طالب ہے، ذہین بچے دو دو اعداد کے مجموعے توڑکر، اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں اور فوراً الٹا اعادہ کر جاتے ہیں یا جنکی قوت تخئیل زبردست ہے، وہ اپنی تخئیل سے کام لیتے ہیں،

تجربہ، نتائج امید افزا نہیں ہیں، بجائے پانچ، چار ہندسوں کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن ابھی کوئی قطعی رائے نہیں دیجا سکتی،

غرضکہ اسی طرح اور عمروں کے لیے بھی آزمائشیں مقرر ہیں، مذکورہ بالا عمروں کی آزمائشوں میں کچھ عملی آزمائشیں بھی شامل تھیں، یعنی آٹھ سال کی عمر میں لکڑی کے چار مربعوں کو پانچویں مربع سے ایک خاص ترتیب میں کھنکھٹانا اور معمول سے کہنا کہ وہ بھی اسی عمل کا اعادہ کرے یا ۱۲ سال کے معمول کو ایک لفافہ اور دو کاغذ دینا ایک صحیح تہ کیا ہوا اور دوسرا کھلا ہوا، اور معمول سے کہنا کہ وہ بھی کھلے ہوئے کاغذ کو اس طرح تہ کردے کہ لفافہ میں ٹھیک آجائے،

دیگر عمروں کی جستہ جستہ آزمائشیں مثالاً درج ذیل ہیں،

۹ سال، دو چیزوں کے درمیان مابہ الاشتراک بتانا، "آم اور نارنگی میں کونسی بات ایک ہے"

۱۰ سال، ۶۰ مختلف چیزوں کے نام دو منٹ کے اندر لینا، ذہین لڑکے التلافات ذہنی سے مدد لیتے ہیں، مثلاً انھوں نے پہلے "آدمی" لیا اور اس کے اعضا بتا گئے، اس کا ذخیرہ جب ختم ہوا تو دوسری شی لیکر اس کے متعلقات بتانے لگے: بلید الذہن ایک شے آسمان کی لیتے ہیں تو دوسری زمین کی اور

مشکل سے آٹھ دس نام لے پاتے ہیں کہ وقت ختم ہو جاتا ہے،

۱۱ سال، نفس میں کوئی خاص ارتقا نہیں ہوتا، اسلیے کوئی آزمائش مقرر نہیں،

۱۲ سال، آزمائشیں مع تنقید تفصیل سے اوپر دیجا چکیں،

۱۳ سال بھی ارتقائے نفسی کا عالم برزخ ہے، کوئی آزمائش اس سن کے لیے مقرر نہیں ہے،

۱۴ سال ایک کاغذ کے پرچہ کی چار تہیں کرکے معمول سے پوچھنا کہ اگر ہم اس مقام پر سوراخ کریں اور کاغذ کو کھولکر دیکھیں تو اسکی شکل کیسی ہوگی، دوسرا کاغذ دیکر اس پر نشانات لگوانا،

(۲) رحم، انتقام، فیاضی وغیرہم کی تعریف کرانا،

(۳) تین اشیاء کا قدر مشترک دریافت کرنا، مثلاً گائے، سانپ، پرند،

بعض محققین نے تین سال سے سولہ سال تک فرداً فرداً آزمائشیں مقرر کی ہیں لیکن سولہ سال کے اوپر کوئی نہیں جاتا ہے کہ ارتقائے ذہن کی حد ۱۶ سال تک ہے، انسان کا دماغ اس عمر میں اپنے انتہائی وزن کو پہنچ جاتا ہے، اور بعدازاں اس کی مقدار میں سرمو اضافہ نہیں ہوتا، بعض کے خیال میں ۱۵ برس انتہائی ہیں لیکن اس میں اختلاف مرز بوم کے مطابق، اختلاف ہونا، لازمی ہے،

انفرادی مساحت ذہنی کا طریقہ یہ ہے کہ اول اس عمر کے سوالات کئے جاتے ہیں جو فی الواقع معمول کی ہے، اگر وہ صحیح جوابات دے تو اس سے اونچی عمر کے سوالات کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ جواب دینے سے وہ قاصر رہے، لیکن اس کے خلاف اگر معمول اپنی عمر کی آزمائشوں میں پورا نہیں اترتا ہے تو نیچی عمر کے سوالات کئے جاتے ہیں، یہانتک کہ وہ پاس ہو جائے، فرض کرو آٹھ سال کا معمول بارہ سال تک کی آزمائشوں میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کی ذہنی عمر بارہ سال ہوئی، حالانکہ طبعی عمر ۸ سال ہے، ذہنی اور طبعی عمر کی نسبت اصطلاح میں معمول کا "ذہنی خارج قسمت" کہلاتا ہے، اگر ذہنی وطبعی عمر، مساوی ہے تو ذہنی خارج قسمت ۱۰۰ اگر دانا جائے گا، لیکن بالفرض عمر طبعی ۸ اور ذہنی عمر ۱۲ ہے تو عقلی خارج قسمت برابر ہوگا ۸/۱۲ × ۱۰۰ یعنی

۵۰ ا کے، اسی طرح اگر کسی ۱۲ سال کے معمول کی ذہنی عمر ۱۴ سال ثابت ہو تو اس کا ذہنی خارج قسمت برابر ہوگا $\frac{۱۴}{۱۲}$×۱۰۰
یعنی ۱۱۶ء۶۶ اعشاریہ ۱ کے،

محققین فن بجائے ذہین و غبی کے غیر متعین الفاظ بولنے کے ذہنی خارج قسمت کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ اوسط درجہ کے طلبا کا ذہنی خارج قسمت ۹۰ سے ۱۱۰ تک کہا جاتا ہے، ذکی الطبع طلبا کا ۱۱۰ سے ۱۲۰ تک بولا جاتا ہے، اور بجائے اس کے کہ یہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں شخص بڑا فطین ہے، یہ کہتے ہیں کہ اسکا ذہنی خارج قسمت ۱۲۰ سے اوپر ہے یعنی ۱۳۵-۱۴۰ وغیرہ ہے،

عملی مساحت ذہنی،

یہ نظام دراصل گونگے، بہرے اور غیر ملک کے بچوں کی ذہانت کی آزمائش کے لیے وضع کیا گیا تھا اس نظام کا آلۂ امتحان زبان نہیں بلکہ عمل ہے، اکثر طلبا کو اشارہ سے بتا دینا کافی ہوتا ہے،

اس امتحان کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے، ایک ہی قسم کی دو تصویریں لو، ایک کے قینچی سے کاٹ کر آٹھ ٹکڑے کرو، سالم تصویر، اور ٹکڑے معمول کے سامنے رکھ کر ٹکڑوں کو سالم تصویر کی شکل میں ترتیب دلاؤ، ایک تصویر بھی اس عمل کے لیے کافی ہے، اسی قبیل کے ہر سن وسال کے لیے آزمائشین مقرر ہیں،

اسی اصول پر بعض ماہرین فن نے لکڑی کے تختے تیار کیے ہیں، جن میں اقلیدس کی مختلف شکلیں کٹی ہوتی ہیں، اور ان شکلوں میں صحیح صحیح پیوست ہو جانے والے لکڑی کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں معمول سے یہ ٹکڑے ان شکلوں میں رکھ دینے کو کہا جاتا ہے، معمول کے حرکات کو بغور دیکھا جاتا ہے، غبی غلط شکلوں میں ٹکڑے رکھ دیتے ہیں اور انھیں کچھ احساس نہیں ہوتا ہے اور ذہین، اگر ٹکڑے کا ٹکڑا غلط خانہ پر لا کر پلٹا لیجاتے ہیں اور اس کے مخصوص خانہ میں اُسے نصب کر دیتے ہیں، اگر خانہ کے اوپر لکڑی کا ٹکڑا لا کر معمول واپس لے جائے تو اس کے نمبر نہیں کاٹے جاتے ہیں، عمل میں وقت کی قید ہے، اس قسم کے بہت سے تختے وضع کئے گئے ہیں، جن میں مختلف شکلیں، مختلف اصول کے ماتحت بنائی گئی ہیں، مثلاً بعض تختے ایسے ہیں

جس میں دو دو ٹکڑے رکھے جاتے ہیں، سن وسال کے اعتبار سے مختلف آزمائشیں مقرر ہیں، مثلاً معمول کے داہنے بائیں ہاتھوں سے علحدہ علیحدہ رکھوانا، دونوں ہاتھوں سے رکھوانا، آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی عمل کرانا وغیرہ وغیرہ،

ذیل میں اسی قسم کے ایک تختہ کی شکل دیجاتی ہے جو "تختہ گاڈرڈ" کے نام سے موسوم ہے،
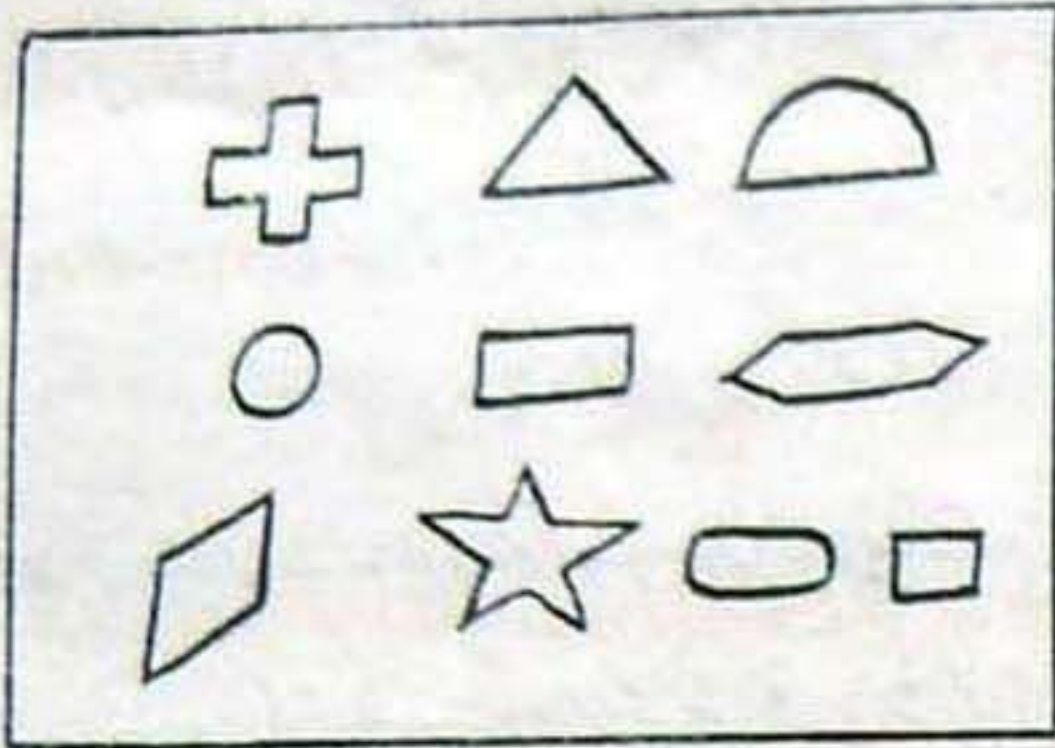
(باقی)

فلسفۂ اقبال،

از

جناب اکرام الحق صاحب سلیم، بی، اے،

در ویدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال،

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

(گرامی)

مغرب کے نقادانِ سخن کہتے ہیں، کہ "زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا رہتا ہے، اور ہر شاعر اپنے زمانہ کے حالات کا ایک مجسمہ ہوتا ہے" شاعری کی تاریخ اس دعوی کا ایک بیّن ثبوت پیش کرتی ہے، اور اقوامِ عالم کے مختلف زمانوں کی حالت اوسکی صداقت کی ایک مکمل دلیل ہے،

جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر ہوتا ہے، اوس کے افراد میدانِ کارزار کو عیش و نشاط کا ایوان خیال کرتے ہیں، شمشیر کی عریانی، ہلالِ عید کی تابانی کا لطف پیدا کرتی ہے، تو شاعر نعرۂ جنگ بلند کرتا ہے، اور قتل و غارت کا طبل بجاتا ہوا اُٹھتا ہے، وہ گوہر افشاں نہیں شرر ریز ہوتا ہے، اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے چنگاریاں برستی ہیں، اس کے اشعار خنجر براں سے تیز تر ہوتے ہیں، انکی شعلہ بیانی میں ایک داستانِ شجاعت پنہاں ہوتی ہے جو ملکوں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہے، اس نوع کے شاعر ازمنۂ تاریک میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہسپارٹا کی فتوحات کا باعث ایک نحیف البدن شاعر تھا جسے یونانیوں نے فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ رکھا تھا، عرب کا نابینا شاعر قیس عبسی قبیلوں کی قسمت کا مالک سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کا ایک شعر ہنگامۂ قتال کی آتش افروزی کے لیے کافی تھا،

قوم کی ہستی میں ایک اور دور آتا ہے، جب قوم حکمراں ہوتی ہے، اس وقت جد و جہد زندگانی اور مقابلہ

کا فقدان قوائے حیات میں اضمحلال اور سکون پیدا کر دیتا ہے، اور ابتدائی ذوقِ نشو و نما مسلک قناعت سے تبدیل ہو جاتا ہے، شاعر ایک بے قاعدہ ہستی ہوتی ہے جو ارباب دولت اور ثروت کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتی رہتی ہے، صنف شاعری میں قصائد اور غزل کو فروغ ہوتا ہے، اگر اول الذکر کسی صاحب اقبال کی تعریف اور توصیف اور موخر الذکر حسن و عشق کے چرچے کی ند ہوتی ہے، حقیقتہً شاعری میں ایک تنزل شروع ہو جاتا ہے جس کی ابتدا قوم کے آفتاب ترقی کے زوال کیساتھ ہونے لگتی ہے،

(۳) اس حالت سے گرنے پر ایک تیسرا دور آتا ہے، جب قوم کی حالت ایک عبرت انگیز انجام کو پہنچ چلتی ہے، اسے اپنی پستی اور تنزل کا کوئی احساس نہیں ہوتا، غیر ٹھوکریں مارتے ہیں ظلم کرتے ہیں، ان کا حق دبا بیٹھتے ہیں، مگر افراد قوم کچھ ایسے قعر ذلت میں گرے ہوتے ہیں کہ چپکے سے بے شرمی کی باتیں سہے جاتے ہیں، اور اپنے انحطاط کو انتہائی تہذیب اور اپنی بے غیرتی کو قناعت اور صبر کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں، اس وقت نظام طبعی کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے قدرت کروٹ بدلتی ہے، اور اس زمین شور سے ایسے پیغمبرانِ سخن اُٹھاتی ہے جو اپنی اعجاز بیانیوں سے نیم مردہ قوم کے یخ بستہ جذبات کو سخن کی آگ سے گرما دیتے ہیں، اور ملت کی مردہ رگوں میں خونِ زندگی کی ایک لہر دوڑا دیتے ہیں، قوم کو اسلاف کے کارناموں کی خبر دیکر یقین دلاتے ہیں کہ اس قوم میں ابتک بھی ترقی کے اجزا موجود ہیں۔ ؎

تو از دمیدنِ گل و لالہ نا اُمید مشو، کہ شاخ زندگی ما ہنوز نمناک است (اقبال)

جب ملت بیضا کا آفتاب ترقی "توارت بالحجاب" ہو گیا اور "رفتہ رفتہ افراد قوم پر فرسودہ، سست رگ اور زندگی سے گریز کرنے والی عجمیت غالب آ گئی"، اور ان کے طبائع پر مسلسل جمود و سکون مستولی ہو گیا یعنی جیسا کہ علامۂ اقبال اس کا خاکہ کھینچتے ہیں،

العجمی در دشت خویش از راہ رفت | از دم او سوز الا اللہ رفت

مصریان افتادہ در گرداب نیل | سست رگ تورانیان ژندہ پیل

آل عثمان در شکنجِ روزگار | مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ | خود فروشی دل ز دیں بر کندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند،
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

تو اس وقت ملت کو بیدار کرنے اور آیۂ انتم الاعلون کے تعین اور استحکام کے لیے ضروری ہوا، کہ ایسے ایسے رسولانِ سخن اٹھیں جو قوم میں حسیاتِ نفس و حیات کا اعادہ کر دیں،

ہندوستان کی اسلامی دنیا میں حالی اس سلسلہ کا پہلا پیغامبر تھا جس نے اپنے ولگداز نغموں سے خوابیدہ قوم کو جگایا، اکبر کے طعنہ زن اور پر درد نغموں نے اس پر تیل چھڑکا، مگر یہ علامۂ اقبال ہی کا حصہ تھا کہ ان کی شعلہ نوائی سے یہ آگ دنیائے اسلام کے گوشوں تک پہنچی، وہ خود فرماتے ہیں،

زجانِ بیقرار آتش کشادم | دلے در سینۂ مشرق نہادم
گِل او شعلہ زار از نالۂ من | چو برق اندر نہادِ او فتادم

ملت کی پر درد اور عبرت انگیز تباہی کو دیکھ کر اقبال خون کے آنسو رویا اور سب سے پہلے اس کی دقیقہ رس نگاہ نے حیرت انگیز ندرت بینی سے محسوس کیا کہ یورپ کی مادی تہذیب دنیا کو بامِ ترقی کی طرف نہیں بلکہ غارِ تنزل کی طرف سے لیجا رہی ہے، دولت کی قدر، پرستش کے درجہ کو پہنچ چکی ہے افراد میں جذبۂ روحانیت بالکل مفقود ہو چکا ہے، اور مادیت مذہب کے خلاف مکمل جنگ کر رہی ہے، نتیجہ ظاہر تھا، اقبال نے یورپ کو متنبہ کیا،

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے | جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

طلوعِ اسلام میں بھی فرمایا ہے، ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی | یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے،

علامۂ اقبال کی شاعری کا مطمعِ نظر خصوصاً اسلامی ہے اور وہ اپنے گرانقدر اصولِ ترقی کی تعلیم کے لیے

آیات شریفہ، احادیث صحیحہ اور آثار سلف کے استنباط سے اکثر کام لیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کے معانی کے صحیح ادراک کے لیے قرآن کریم اور احادیث اور اسلامی تواریخ سے اچھی خاصی واقفیت لازمی ہے، ان کا ایک خاص طرز یہ ہے کہ قوم کے گذشتہ کارناموں کو یاد دلا کر ان کے تقابل سے، اسے اپنے موجودہ انحطاط کا احساس کرانا چاہتے ہیں، ؎

اے پریہا جوہر اندر تابِ تو | ذو الفقارِ حیدر از اسلافِ تو

ملت کے قوائے حیات کے احیا کے لئے ان کے نزدیک صرف ایک تدبیر ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم بھی عرب کی طرف متوجہ ہوں، اور رسولِ عربیؐ کے احکام کی پیروی اپنا خاصہ بنائیں، فرماتے ہیں،

دل بہ سلمائے[1] عرب باید سپرد | تا دمد صبحِ حجاز از شام کرد
از چمن زارِ عجم گل چیدۂ | نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمیٔ صحرا بخور | بادۂ دیرینہ از خرما بخور

اخوت اسلامی

یہ مسلم امر ہے، کہ ملت بیضا اپنی موجودہ پراگندہ صورت میں اقوام مخالف کے حملوں سے مشکل سے جانبر ہو سکتی ہے، اس کے تسلسل اور استحکام کا راز فقط اس کے اجتماع میں مضمر ہے، علامۂ اقبال "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"اس وقت دنیا میں اور بالخصوص اسلامی ممالک میں، ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید اور تولید ہو، قابلِ احترام ہے"

اور یہی مقصود علامۂ اقبال کی تمام تر سعی کا ہے، وہ چاہتے ہیں، کہ ملت کے پراگندہ افراد کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیں تاکہ "انفرادی اعمال کا تباین اور تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا

[1] سلمیٰ، ادبیات عرب میں معشوقہ کا نام ہے، اس جگہ پر قرآن کریم اور اسکی تعلیم مراد ہے،

ہو جائے" اور "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کا اصلی مفہوم عوام کے دلوں میں جاگزیں ہو، فرماتے ہیں ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اسلام بذاتہٖ ایک ہمہ گیر اخوت اور الفت کا مرکز ہے اور اس کا مدعا یہ ہے کہ اس کے منتشر اوراق ایک ہی شیرازہ میں مجتمع نظر آئیں، اس عظیم الشان مقصود کے حصول میں اسلام ملک و ملت کی قیود اور بندشِ مکانی سے آزاد ہے، ؎

قلب ما از ہند و روم و شام نیست　　مرز و بوم او بجز اسلام نیست

عقدۂ قومیت مسلم کشود　　از وطن آقائے ما ہجرت نمود

یاس اور حزن| علامہ اقبال کے نزدیک استحکام حیات تخلیق و تولیدِ مقاصد سے وابستہ ہے، یاس و حزن ام الخبائث اور قاطع حیات ہیں اور جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں صرف توحید ہی ان امراض خبیثہ کا ازالہ کر سکتی ہے، اُن کا ہر شعر شعاع اُمید و آرزو سے تابندہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ خود ملت بیضا کے ظاہری اور باطنی اضطراب سے متاثر ہیں اور اس کے مصائب پر اشک ریز، تاہم آیہ "لا تقنطوا" پر انہیں کامل بھروسہ ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں، ؎

مرگ را سامان ز قطع آرزوست　　زندگانی محکم از لا تقنطوا ست

حضرتِ اقبال ہمہ تن اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مسلمانوں کو یاس کے خواب اور اثر سے نجات دلا کر اُن کے دلوں کی ظلمت کو امید کی تنویر سے متبدّل کر دیں، تاکہ پھر قوم کے افراد جذبۂ عمل اور جان فروشی سے متمیز نظر آئیں، ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

جد و جہد زندگانی کا فقدان انحطاط کا پیش خیمہ ہے، اور افرادی یا ملی زندگی کے تدریجی نشو و نما اور تسلسل کا راز فقط تعینِ عمل سے وابستہ ہے، علامہ اقبال اس نکتہ کو بار بار بیان فرماتے ہیں، اگر بہترین پیرایہ اس شعر میں اختیار کیا ہے،

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی　　ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

یاس ہی ایک ایسی چیز ہے جو عمل کیلئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام تصنیفات جن میں یاس اور حزن کا عنصر مستولی ہو قوموں کے جادۂ ترقی میں عوائق پیدا کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ اُن خیالات کی توسیع سے معتد بہ جسمانی اور روحانی تنزل رونما ہو جاتا ہے، عجمی تصوف کے زیر اثر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں یہ عنصر نمایاں ہے،

آن نہالِ سربلند و استوار　　مسلمِ صحرائے اُشتر سوار

آن چناں کاہید از بادِ عجم　　ہمچو نے گردید از بادِ عجم

باوجود ان تمام مشکلات کے جو اس وقت دنیائے اسلام کو محتوی ہیں اور جنکا انھیں کامل احساس ہے، حضرت اقبال اسلام کے لیے ایک منور مستقبل کی پیشگوئی فرماتے ہیں، اور بار بار مسلمانوں کو فہمائش کرتے ہیں، کہ خدا کی رحمت سے انھیں نا امید نہیں ہونا چاہیئے، وہ وقت قریب آنیوالا ہے جب آفتابِ اسلام پھر قدیم سطوت اور درخشندگی سے طلوع ہوگا، فرماتے ہیں، ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں　　آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

. . . .

. . . .

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار،

ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار،

خود اعتمادی و خودداری| خود اعتمادی اور خودداری کا عدم وجود انحطاط قومی کا لازمی نتیجہ ہے، جب کسی قوم

میں تنزل رونما ہوتا ہے، اس کے افراد میں جذبۂ غیرت اس قدر مفقود ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذلت اور فرومائیگی کے احساس سے قاصر ہوتے ہیں، ہر چیز میں انھیں اغیار کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، حتیٰ کہ اپنی ترقی کیلئے بھی دوسروں کی پامردی پر حصر کرنے لگ جاتے ہیں، بہر حال یہ انھیں محسوس کر لینا چاہیئے، کہ قوم کی خاص ترقی اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک کہ ترقی کے اجزا کا استیناف اس کے افراد کے دلوں میں نہ ہو، اور بلا استظہار غیرے وہ اُس کے حصول میں کوشاں نہ ہوں،

حضرت اقبال نے خود اس نکتہ کو "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں بخوبی واضح کر دیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

" . . . . . زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ اسکا وجود انسانوں کی ضمیر میں متشکل نہ ہو فطرت کا یہ اٹل قانون جسکو قرآن نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اس صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے"

غرضکہ اقوام و افراد کا تسلسل جہاد، دوام عمل، پختگیِ یقین، اور احساسِ خودی پر مبنی ہے، ؎

پیکرِ ہستی ز آثار خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

اور انا کی حفاظت، اسکی تربیت، اور استحکام کا راز خودداری اور استغنا سے وابستہ ہے، سوال خودی کو ضعیف کر دیتا ہے، قوائے حیات میں اس سے جمود پیدا ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سر اقبال خودداری کے بہت زبردست حامی ہیں اور بار بار اس کی تلقین مختلف پیرایہ میں فرماتے ہیں،

تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

"خضرِ راہ" میں فرماتے ہیں،

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بحالت سواری اشتر حضرت فاروق اعظمؓ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا، اسے زمین پر سے اُٹھانے کے لیے آپ خود زمین سے اترے اور اس معمولی کام کے لیے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا، اس واقعہ کی طرف تلمیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ الحذر از منتِ غیر الحذر

علامہ اقبال خود بھی بہت مستغنی المزاج واقع ہوئے ہیں، چنانچہ اپنے متعلق فرماتے ہیں،

من فقیر بے نیازم مشربم این است و بس مومیائے خواستن نتوان شکستن می توان

اقبال کا فلسفہ خالص اسلامی فلسفہ ہے، اور اقبال کا تخیل اور احساس اسلام سے وابستہ ہے، ڈکلسن صاحب اور ان کے ہمخیال نقادِ فلسفۂ اقبال کو یورپ کے فلسفہ کے زیر اثر ٹھہرانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں اور ان کے "نائب حق" کے تخیل کو نیٹشا کے "فوق الانسان" کا مرہون منت کیوں نہ سمجھیں مگر لاحاصل سوائے اس کے کہ انکی لاعلمی ثابت ہو، اور کوئی مفاد نہیں، ایسے خیالات کی تردید تو علامۂ اقبال نے خود "کوسٹ" میں کر دی ہے، لکھا ہے،

"مقام تاسف ہے کہ مغرب اسلامی فلسفہ سے اس قدر ناآشنا ہے، کہ مجھے اگر اس بحث پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی فرصت ہوتی تو میں یورپ کے علمائے فلسفہ کو بتا سکتا، کہ ہمارے اور ان کے فلسفہ میں کس بڑی حد تک اشتراک ہے، . . . . " (معارف)

علامۂ اقبال کے نزدیک انسان ایک مستتر طاقت کا مرکز ہے، جس کے ممکنات زندگی ایک خاص طریق پر عمل پیرا ہونے سے ترقی پا سکتے ہیں، رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے "تخلقوا باخلاق اللہ" اپنے اندر اخلاق اللہ پیدا کرو،

انسان جتنا ہی کہ خدا کے نزدیک تر ہو جاتا ہے، اتنا ہی کامل تر ہو جاتا ہے، یہ نہیں کہ وہ فنا فی اللہ ہو جاتا ہے بلکہ اللہ کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، ع یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ "

زندگی ایک حرکت جاذب ہے، اک سعی آزادی، اک انتہائے سعی انسانی، جو اپنی پیش روی میں اپنے راستہ کی رکاوٹوں کو خود اپنے اندر جذب کرکے دور کردیتی ہے،

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے یا یوں کہوں کہ نیچر تاہم نیچر اس لحاظ سے کہ وہ زندگی کی اندرونی طاقتوں کو اس قابل بناتی ہے، کہ وہ عدم سے وجود میں آئیں، اپنی ذات میں "شر" نہیں انسان کے اندر زندگی کا مرکز "خودی" یا "انا" ہے، اسکی تومیع اور تربیت جدوجہد سے وابستہ ہے اور اس کا تحکم "عشق" سے ہے،

"عشق" کا استعمال بہت وسیع معنوں میں ہونا چاہیئے، خودی کو اپنی تکمیل میں تین مراحل طے کرنے پڑتے ہیں مرحلۂ اول اطاعت، مرحلۂ دوم ضبط نفس، مرحلۂ سوم نیابت الٰہی، ذوق عمل کا عدم وجود انحطاط کا بیّن ثبوت ہے، اس لیے تمام ایسی چیزوں سے جو خودی کو ضعیف کردیں، احتراز واجب ہے، ادبیات، مذہب، اخلاقیات کے اثرات کا صحیح اندازہ اسی معیار سے قائم کیا جاتا ہے،

اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے اقبال "نیوایرا" (New Era) میں لکھتے ہیں

"تمام انسانی جدوجہد کا انجام نفتا حیات ہے، اور تمام انسانی علوم و فنون اسی مقصد کے حصول کے تابع ہیں، جیسے ہر علم و فن کی منفعت کا اندازہ، اس کی حیات آفرین قوت ہی سے لگایا جاسکتا ہے، مثلاً اعلیٰ ترین فن وہ ہے جو کہ ہماری جبلی قوت ارادی کو بیدار کرے، اور ہمیں مصاف زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشے، تمام خواب آور اثرات "جو حقیقت" (Reality) سے گریز کرنے کی تعلیم دیں، فی نفسہ ایک پیام انحطاط و ممات ہیں ادبیات کو "دنیائے افیون خوردہ" کے نقوش سے مبرا ہونا چاہیئے۔ . . . العلم للعلم (art for the sake of art) کا اصول ایک زمانۂ تنزل کی ایجاد ہے جس کا مقصد ہمیں ذوق حیات اور جذبۂ عمل سے محروم کردینا ہے"؛

افلاطون کے فلسفہ کی تنقید علامۂ اقبال نے اسی نقطۂ نگاہ سے کی ہے، ان کی یہ تنقید ان اصول کے

خلاف ہے جو اپنی انتہا بجائے زندگی کے موت قرار دیتے ہیں، یہی وہ اصول ہیں جو بجائے اس کے کہ ہمیں زندگی کے دشوار گذار مراحل کے طے کرنے کی تعلیم دیں اس سے گریز کرنا سکھاتے ہیں،

راہب اول فلاطون حکیم | از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است | شمع را صد جلوہ از افسردن است

اس فلسفہ کا اثر مسلمانوں کے تخیل پر جس حد تک ہوا ہے، اس سے بہت کم لوگ کماحقہ آگاہ ہیں، جب مسلمانوں نے منشائے حیات اور مقصد تخلیق انسانی کی توضیح کے لیے فلسفۂ یونان بغور دیکھنا شروع کیا، تو وہ سب سے پہلے ارسطو کی طرف متوجہ ہوئے، مگر ارسطو کی اصلی اور مستند تصانیف کے دستیاب نہ ہونے کے سبب سے انھیں ان کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا جو ارسطو کی تصانیف کی تراجم بتائی جاتی تھیں، مگر دراصل پیروان اشراق (Neo Platonists) کی تالیف کا نتیجہ تھیں، یہی وجہ تھی کہ فلسفۂ ارسطو جس کو مسلمانوں نے پڑھا در حقیقت پلوٹینس پروقلس اور دیگر پیروان اشراق کی کاوش فکر کا نتیجہ تھا،

علامۂ اقبال فرمایا کرتے ہیں، کہ وہ ابھی کیمبرج ہی میں تھے اور کسی انگریزی رسالہ کے لیے "سیاسیات اسلام" پر ایک مضمون لکھ رہے تھے کہ یکایک اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ "خدا جانے مسلمانوں کے زوال کا نفسیاتی محرک کیا تھا"؛

اس سوال کے جواب کی تلاش میں انھوں نے عربی تواریخ کو چھان مارا، انگریزی مؤرخوں کی تصنیفات کو بھی دیکھا مگر بے سود،

اُن سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کیا وجہ تھی کہ ایک ایسی جماعت جس میں استمرار عمل کا ہر ممکن عنصر موجود ہو، غیر معمولی تیزی سے اُبھرے اور پھر زوال پذیر ہوجائے در حقیقت اس سوال کا جواب جیسا کہ وہ اپنی فارسی تصانیف میں متعدد بار بیان فرما چکے ہیں، افکار و خیالات کا اثر اور عالمان کم نظر کا اجتہاد ہے [illegible]

عجمی تصوف پر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، افلاطون کے فلسفہ کا بہت گہرا اثر پڑا ہے، اور انہی خیالات کی توسیع ہے جو اسلام کے انحطاط کی وجہ ہو سکتی ہے، رسول مقبول صلعم کے بعد ان کا شخصی نفوذ صحابۂ کرام میں کام کرتا رہا اور اسی کی بدولت تھا کہ مسلمان ایک ہمہ گیر سیلاب کی طرح تمام دنیا پر پھیل گئے مگر جس قدر آپ کا زمانہ دور ہوتا گیا، لوگوں کا جذبۂ عمل کم ہوتا گیا حتیٰ کہ بمطابق حدیث قدسی "خیر القرون قرنی . . . . ." چوتھی نسل کے بعد زوال شروع ہو گیا جب تک مسلمانوں کے سامنے "زندہ قرآن" موجود تھا، انھیں کسی قسم کے تجسس و تفحص کی ضرورت نہیں تھی مگر نبی کریم صلعم کے بعد اکثر علما کسی ایک مطلب کی تشریح اور توضیح کے لیے یا تو یونان کے فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے اور یا آیات شریفہ کی تاویلیں کیں، رازی نے استدلال[1] سے کام لیا، غزالی نے فلسفہ یونان کی تردید کی، ائمہ نے احادیث نبوی کو جمع کیا، غرضکہ بہت کچھ ہوا جو نہایت مفید تھا، مگر "ترک دنیا" اور اس قسم کے "رہبانی خیالات" جو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو چکے تھے مفقود نہ ہو سکے، علمائے تصوف اصلی مفہوم کو چھوڑ کر ظاہری رسوم میں محصور ہو گئے،

صوفی پشمینہ پوش حال مست از شراب نغمۂ قوال مست

آتش از شعر عراقی در دلش در نمی سازد بقرآن محفلش

از کلاہ و بوریا تاج و سریر فقر او از خانقاہان باج گیر

واعظ دستان زن افسانہ بند معنیٔ او پست حرف او بلند

تنگ بر ما رہگذار دیں شدہ است ہر لئیمے راز دار دیں شدہ است

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

رسکن کا قول ہے

[1] علامہ اقبال فرماتے ہیں، ز رازی معنیٔ قرآن چہ پرسی ضمیر ما بآیاتش دلیل است،

مولانا مرحوم نیز فرماتے ہیں، گر بہ استدلال کار دیں بدے فخر رازی راز دار دیں بدے

"کہ اگر کسی مصنف میں کچھ قابلیت کا مادہ ہے تو تم اس کے معنی بادی النظر میں نہیں سمجھ سکتے، بلکہ ان کے صحیح ادراک کے لیے کافی دقت چاہیئے"

یہی خصوصیت ہے جس سے علامۂ اقبال کے اشعار ممتیز نظر آتے ہیں ان کے ہر ایک شعر میں ایک جہان معنی مستور ہوتا ہے، اور ہر مصرع میں حقائق اور معارف جلوہ گر ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کا مکمل ادراک بادی النظر میں دشوار ہوتا ہے مگر ذرا سی کوشش سے تمام غوامض آشکارا ہو جاتے ہیں، یہ نہیں کہ ادق الفاظ کا استعمال بے وجہ عام ہوتا ہے، نہیں بلکہ الفاظ کی موزونیت، کلام کا اختصار اور اسکی معنویت اشعار کو مشکل بنا دیتی ہے

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے بمعنیٔ کہ بر و جامۂ سخن تنگ است

مغرب کے نقاد جہاں اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف کرتے ہیں، وہاں یہ بھی کہدیتے ہیں، کہ ان کی تعلیم "ایک شگون نحس" ہے جو دنیا کو جنگ و جدال کی طرف لے جا رہی ہے، انھیں یہ خوف ہونے لگ گیا ہے کہ کہیں اسلام پھر اصلی قوت میں آکر مغرب کو تسخیر نہ کر ڈالے، اسلیے وہ اقبال کی تعلیم کو خونخواری کی تعلیم بتلاتے ہیں، اس خیال کے پیرو صرف انگریز ہی نہیں بلکہ چند ایک ہندی بھی ہیں، حال ہی میں مسٹر عثمان آر، سی، ایس نے "انڈین ریویو" میں جو مضمون اقبال پر لکھا ہے، اس میں اسی بات کے ڈر کا اظہار کیا ہے، مگر انھیں معلوم کر لینا چاہیئے، مردانگی، شجاعت اور خودی، کی تعلیم خونخواری کی تعلیم نہیں ہے، اقبال اخوت اسلامی کا علمبردار ہے اور رنگ و خون کے امتیازات کو مٹانے کے لیے آیا ہے، وہ ان عظیم الشان اصولوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے انسان مکمل ہو سکے، وہ ایسا جادۂ عمل ملت کے سامنے پیش کرتا ہے، جس پر گامزن ہو کر قوم منزل مقصود پر پہنچ سکے اقبال کے ہر شعر میں ایک جہان سوز پنہاں ہے، اس کا ہر مصرع اک جذبۂ آتشین سے معمور ہے جسکی تاثیر سے دنیائے اسلام میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا ہے، اقبال شاعر بھی ہے، عالم بھی ہے، فلسفی بھی مگر یہ عوام کی کم نظری کا سبب ہے کہ وہ اسکی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے،

ز اقبال فلک پیما چہ پرسی، حکیم نکتہ دان ما جنوں کرد،

عبدالستار بن قاسم لاہوری

اکبری عہد کا فرنگی زبان کا مترجم،

از

جناب حافظ احمد علی خانصاحب ناظم کتبخانہ ریاست رامپور،

کتاب خانۂ ریاست میں ثمرۃ الفلاسفہ نامی تاریخ فارسی میں ایک قلمی کتاب ہے، تقطیع کتاب ۱۱×۷ تقطیع کتابت ۸½ × ۴½ انچ، سطر ۱۵، بد خط نستعلیق، صفحات ۲۶۶ ہیں، فضل علی ولد قادر بخش ساکن قصبہ سوز، نے ۱۲۶۶ھ میں اس کو نقل کیا ہے، کتابت نہایت غلط اور املا بھی نادرست ہے،

آغاز کتاب :- "سپاس الٰہی وستائش جان آفریں در آغاز نامہا رسم است"

دیباچہ میں مترجم لکھتا ہے :-

"بندہ عبدالستار بن قاسم را از بخت مندی وسعادت سرمدی آرزو جوشید ودیمان بست کہ اگر آسمان دستگیری کند وکارساز ان آسمانی درے از دانائی بریں پرستار طبعی برکشایند خدمتے کہ تہمت انبازی برنتابد بجہت بادشاہ وصاحب روزگاران بجاآرد، لیکن سراسیمگی در گرفت دازکم مائگی بحیرت شد کہ این شگفت آرزو چگونہ سامان گیرد واین گونہ خدمتے کہ ارمغانے باریافتگان درگاہ مقدس باشد وتہمت انبازی برنتابد من کج مج زبان بے یادر دکجا ردے نماید، روزہائے بسرآمد، وروزگارہا ازگذشت بدیں بودم کہ (و) بدیں ہیگذرانیدم، ناگاہ درے از دولت برکشاوند وستارۂ بخت مندی بدرخشید، شہنشاہ غیب دان کو خواہش نوامی وکام بخشی خوئے پسندیدۂ اوست، ایں گمنام را طلب فرمود، فرمان شد کہ زبان فرنگی آموزد، واسرار این ملت واحوال سلاطین این گروہ وحکمائے یونان زمین ولتین از روئے کتب ایشاں بفارسی گذارش دہد کہ آنچہ از بیگانگی زبان ونبودن مترجم در دوری راہ از نہان خانۂ خفا در روزگاران بیروں نیامدہ است، دریں زمان ہمیشہ بہار دانائی برفراز پیدائے برآید، واین گروہ نصاریٰ کہ پیوستہ پیشانی نیازمندان برآستان مقدس دارند (و) از درگاہ ہمایوں کام دل برگیرند"

مترجم نے فرنگی زبان لکھا ہے، اس عہد میں فرانسیسی، انگلستانی، اور پرتگیزی سب ہی آتے جاتے تھے، نہیں معلوم اس سے کونسی زبان مراد ہے،

پھر کہتا ہے کہ ظل الٰہی کی فرمائش کو ایزدی فرمان سمجھکر کام شروع کیا، پادری جرونمو شویر (Padre Geronimo-Xavier) دانایان فرنگ میں سے برگزیدہ شخص حال ہی میں دربار میں آیا ہے اس سے زبان سیکھنا شروع کی، اقبال روز افزوں یاور ہوا، چھ مہینے میں اس زبان کے مطالب علمی وعملی سمجھنے کی طاقت آگئی، بات چیت کم کرنے اور شغل ترجمہ کی وجہ سے اس زبان میں گفتگو کی مہارت نہین ہوئی ہے، لیکن بادشاہ کی خواہش پوری ہوگئی، پادری جرونمو شویر بادشاہ کو اس کتاب کے پورے مطالب سنا بھی نہ چکا تھا، کہ میں نے یہ ترجمہ پورا کرلیا، الحمدللہ کہ تھوڑی ہی مدت میں غوامض اسرار علمی وعملی اس گروہ کے، احوال مسیح ؑ وبادشاہان روم ویونان وحکما کے حالات لکھ گئے، یہ حالات انجیل اور کتاب سنت اتنین سے لیے ہیں البتہ حکما کے حالات میں دوسری کتابوں سے بھی مدد ملی ہے، ہر بادشاہ کے حالات کے ساتھ اس کے عہد کے حکما کے واقعات بھی بیان کردیے ہیں،

حکما کی زاد وبوم کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، کوئی ان کو رومی اور کوئی یونانی کہتا ہے، اس اختلاف کی یہ بنا ہے کہ گریسیہ نے جسکو یونان بھی کہتے ہیں، اتالیہ پر قبضہ کرلیا تو اس کو بھی گریسیہ کہنے کا حکم دیا، جب سلاطین رومہ نے گریسیہ پر قبضہ کیا تو اس کو رومہ کہلوایا، پوشیدہ نہ رہے کہ اتالیہ ملک گریسیہ سے مغرب میں ہے، وہان کی زبان لیٹن ہے، اتالیہ، اسپانیہ، فرانسہ، المانیہ اور کستیلہ میں یہی زبان معتبر ہے، کتب علمی وعملی اسی زبان میں ہیں،

اس کے بعد مترجم نے علیحدہ علیحدہ عنوان سلاطین کے قائم کرکے حالات لکھے ہیں،

داستان آبادی رومہ و سلطنت کردن وراں دیار ہفت تن وبرانداختن اسم سلطنت از ملک خویش

اس عنوان کے ذیل میں لکھتا ہے کہ امولیوس (Amulius)

البا کا بادشاہ تھا، اپنے بڑے بھائی نومی تور (Numitor) کو علیحدہ کرکے خود بادشاہ ہوگیا

اور اپنی بھتیجی رمی ام یا ایلیا (Ilia) نامی کو ویستہ (Westa) کے سپرد کردیا، ویستہ اس

زبان میں آگ کو کہتے ہیں، مطلب یہ تھا کہ وہ کنواری رہے اور کوئی اولاد پیدا نہ ہو جو نومی تور کا بدلہ لے، سرنوشت

آسمانی سے اس لڑکی کے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام رومل (Romals) دوسرے کا نام رومس

(Remus) تھا فاسل نامی گڈریہ نے ان بچوں کی پرورش کی، جوان ہوکر ان بچوں نے امولیوس کو

قتل کیا، اور پھر لطالیہ کو چلے گئے، وہاں آفرینش ابو البشر سے چار ہزار چار سو پچاسویں سال، بڑا قلعہ بنایا، رومل

کو رومل نے قتل کرادیا، قلعہ آباد کرنے کے لیے سب ملک کے بدمعاشوں کو عام اجازت دیدی وہ آکر آباد ہوگئے

اخیر میں ایک ابر سیاہ پیدا ہوا اور رومل اس میں غائب ہوگیا، وہ زمانہ بنی اسرائیل میں اشعیا نبی کا تھا،

داستان نومہ نون پیلو؟ (Numa Pampel) یہ شہر سبن (Sabine) کا رہنے والا

تھا، نیا مذہب ایجاد کیا، سال کے بارہ مہینے مقرر کئے، چالیس سال حکومت کی، تول (Tullus Hos Tilius)

جنگ دوست تھا،

(بادشاہ کا نام نہیں ہے) اس کے عہد میں بخت نصر والی بابل بیت المقدس میں آیا، بنی اسرائیل کو تباہ

اور شہر کو خراب کیا، ایک خواب دیکھ کر بھول گیا تھا، دانیال پیغمبر نے خواب بتایا اور تعبیر بیان کی،

داستان مارسیو (Martius) داستان ترکین اول (Tarquinius)

داستان تیریو تولیو (Servius Tullius)

ترکین دویم اس کو ترکین مغرور بھی کہتے ہیں،

اس کے بعد مترجم لکھتا ہے، کہ اکبر بادشاہ کے سامنے مذکورۂ بالا عہد کے حکما کے حالات بیان ہوچکے

ہیں، اسلیے میں یہاں نہیں لکھتا ہوں،

گریسیہ کی نسبت مترجم کہتا ہے "گریسیہ وہ جگہ ہے جہاں اتھینس واقع ہے، زبان کا نام گریک ہے،

یہ بالکل غلط ہے کہ یونان زیر آب ہو، لفظ یونان ان کی کتابوں میں نہیں ہے" اس کے بعد اسپین کا مختصر حال

تا فتح عیسائیان لکھا ہے،

اس کے بعد اس نے داستان شہر بابل در طبقہ حکمائے یونان کو لکھا ہے، کہتا ہے، شیر نواسہ ارنیائیس دامادی

میدت ؟ ہے، اس کو شیروان بھی کہتے ہیں،

ارنیائیس نے خواب میں دیکھا کہ اسکی دختر کے پیٹ سے مانند ہ مین ؟ نام انگور کا درخت پیدا ہوا اور تھوڑے

سے وقت میں اسقدر بالیدہ ہوا کہ تمام آریہ پر جو ثلث حصہ زمین ہے چھا گیا، علمار نے تعبیر کہی کہ تیری لڑکی سے

ایک ایسا فرزند ہوگا کہ کل آریہ پر حکومت کریگا اور تجھ سے سلطنت چھین لے گا،

ارنیائیس نے اپنی لڑکی ایک کم حیثیت شخص سے منسوب کردی، اس سے ایک لڑکا ہوا، ارنیائیس نے اس بچہ کو

قتل کے لیے ہرپاک نامی ایک شخص کے سپرد کیا، مگر اس نے اس کو قتل نہیں کیا، اس لڑکے کی پرورش گڈریے نے

کی، جوان ہوکر اس نے ایرانیوں اور شیر دانیوں کی جنگ میں بڑا کام کیا، پھر اس نے بابل پر حملہ کیا، بند باندھکر

قلعۂ بابل کو دریا سے بہایا، اخیر میں اس کے عہد کے حکماء کے حالات ہیں۔

اسی طرح داستان کنبس بن تیرد (Cambyses) داستان شیر شش بن دریو (Croesus)

داستان ازتشیرتش شیرشش ؟ (Artaxerxes Xerxes) داستان الی شاندر (Darius ?)

یونانی کہ سکندر رومی کے نام سے مشہور ہے، ان بادشاہوں کے حالات کے ساتھ اس عہد کے حکماء کے بھی حالات ہیں،

خاتمہ میں مترجم لکھتا ہے۔۔

سپاس تازہ سرایم وستایش دیگر بگویم، ستائش را در سر نا ہم و پرستش را کمر بر میان بندم کہ از

گزیدگی نیاز و پاس بندگی و تسبیح درست دکوشش حق گذار بتاریخ سیزدہم ربیع الاول روز جمعہ ہزار دوازدہ ہلالی و بست و نہم امرداد الہی روز مار اسفندیار (اسفندار) چہل و ہشت از جلوس حضرت شاہنشاہی (ختم) شد . . . . . واین خردزادہ نہ ماہہ را کہ پیران کہن سال را تجربہ آموز و تجربہ کاران را روشنی افزوز است واز حضرت شاہی پناہی نامی واسم گرامی ثمرۃ الفلاسفہ نام درخدمت گیتی خداوند پیرایہ قبول ارزانی دارا د،

صفحہ ۲۴۱ پر قیصر کے حالات میں لکھتا ہے:-

عجب آنکہ ہمان زمان ولادت مسیح علیہ السلام بود دراین سال چہل و دو از سلطنت قیصر مذکور بودہ است، دچگونگی ولالت این بزرگوار درکتاب دیگر کہ از حضرت شاہنشاہی خلد اللہ ملکہ و سلطانہٗ بنام نامی واسم گرامی مرآۃ القدس غازہ قبول یافتہ بہ تفصیل نوشتہ شدہ،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرآۃ القدس بھی غالباً اسی مترجم کی کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسی قلمی مرتبہ ریو کی جلد اول کے صفحہ تین پر درج ہے، اور پادری جرونو شویر کی تصنیف ظاہر کیا ہے، اس کتاب میں پادری مذکور دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے حکم سے میں نے سات آٹھ سال تک فارسی سیکھی، اور یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حالات میں لکھی اور اس فارسی ترجمہ میں عبدالستار بن قاسم لاہوری نے بھی مدد کی، اس کتاب کے چار باب ہیں، باب اول زمانہ طفلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، باب دوم تعلیم و معجزات، باب سوم رحلت، باب چہارم حیات ثانی،

پادری جرونو شویر نواری (Navare) کا رہنے والا تھا اور آپاسٹل آف انڈیا، ایس، فرانسس شویر (S. Francis Xavier) کا رشتہ دار تھا، ۱۵۹۴ء میں جیسویٹ مشن گوا میں شریک ہوا، اور ۱۶۱۷ء میں گوا میں مر گیا، ایک تاریخ پادری مذکور نے اپنی زبان میں بھی لکھی ہے جسکا نام ہے (Historica relatio ad Regnum magni Magar)

اس تاریخ میں اس نے دربار اکبری کے حالات، اور اکبر و جہانگیر کے ساتھ سفر کشمیر کے حالات لکھے ہیں،

عبدالستار بن قاسم لاہوری کا اور کوئی حال معلوم نہیں ہوا، ثمرۃ الفلاسفہ سنہ ۱۰۱۱ھ کی اور مرآۃ القدس سنہ ۱۰۱۱ھ کی تصنیف یا تالیف ہے، اس نے جہانگیر کے حکم سے سنہ [illegible] جلوسی مطابق ۱۰۲۳ھ اجمیر میں ظفرنامہ کا انتخاب کیا اور وہ منتخب ظفرنامہ کے نام سے فہرست مرتبہ ریو قلمی فارسی کتب جلد اول کے صفحہ ۷۷ اپر درج ہے، مرآۃ القدس کا نسخہ ہندوستان میں اور ثمرۃ الفلاسفہ کا انگلستان میں غالباً نہیں ہے،

میں نے یونانی ناموں کی فہرست میں کوشش کی مگر ناکام رہا، اب کوئی اور فاضل اس کام کو پورا کریں،

تلخیص و تبصرہ

روس میں تعلیمی جدّ و جہد

روس میں انقلابِ حکومت کے بعد سے وہاں کے عام حالات پر یورپ کے "عیار ہاتھوں" نے ایسا پردہ ڈالا کہ ہم وہاں کے نظامِ حکومت، اور داخلی اور خارجی سیاسیات کی لاعلمی کے ساتھ اس کے معاشرتی، تجارتی، صنعتی، علمی اور تعلیمی حالات سے بھی حقیقی معنوں میں بے خبر ہیں، اور کبھی کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں تو ان کا ایک دوسرے کے متضاد ہونے کے علاوہ ان کے ذرائعِ معلومات اس قدر غیر مستند قرار پاتے ہیں کہ ہم ان خبروں سے روس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے، لیکن ماہ دسمبر ١٩٢٥ء کے "الہلال" مصر میں مجلۂ ایشیا کے حوالے سے ایک امریکن سیاح کے حالاتِ سفر کے چند اقتباسات شائع ہوئے ہیں، جو ایک حد تک قابلِ اعتنا کہے جا سکتے ہیں، اسلئے ہم انھیں دیکھکر روس کے تعلیمی حالات کے متعلق کسی نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں، ذیل میں اس مضمون کی پوری تلخیص درج کیجاتی ہے،

عہدِ زار کے روسی طلبہ زار روس کی شہنشاہی میں روس کے مدرسوں میں صرف سرمایہ داروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے کیونکہ غربا کے بچوں کے لیے اولاً نہ وہ آسانیاں موجود تھیں اور نہ انھیں اپنی ابتدائے طفولیت سے کاشتکاری کے کاموں اور کارخانوں کی ملازمت سے فرصت ملتی تھی، اسلئے زار کے ایامِ سلطنت میں روس کی تمام آبادی میں ۸۰ فیصدی سے زیادہ ناخواندہ اشخاص تھے،

انقلابِ حکومت کا اثر طلبہ جب روس میں انقلابِ حکومت ہوا اور زمامِ حکومت بالشویکوں کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے غربا اور مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کی طرف اس بنا پر نہایت سرگرمی سے توجہ کی کہ کوئی تعلیم یافتہ مزدور تعلیم پانے اور اقتصادیات کی حقیقت اور حکومت کا مفہوم سمجھنے کے بعد شہنشاہی کی تائید کے لئے تیار نہ ہوگا، بلکہ

اس کے بجائے وہ بالشویک نظامِ حکومت کا حامی و مددگار ہوگا کہ اس نظام میں اسکی فلاح و بہبودی ہے اور اگر غربا کی جماعت ناخواندہ رکھی جائیگی تو بہت ممکن ہے کہ اپنی جہالت سے مخالفینِ حکومت کے اغوا میں اگر قدیم شہنشاہی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے،

اس نقطۂ نظر کی بنا پر نہ صرف مدرسوں میں غربا کے بچوں کو داخل کیا گیا بلکہ تمام مدارس سے سرمایہ داروں کے لڑکوں کو علحدہ کر کے غربا اور کسانوں کے لڑکوں سے ان جگہوں کی خانہ پری کیگئی،

یہ نئے طلبہ علم و تعلیم سے قطعی نابلد تھے، اس لیے ان کے دماغوں پر جہل و جمود کے تاریک پردے پڑے ہوئے تھے، لیکن اُنکے شوق و شغف اور محنت و کاوش نے ان میں ایک ایسا ملکہ پیدا کر دیا جس نے ان کے ذہنوں سے جہل کا تاریک پردہ ہٹا دیا، اور ان میں ضبط اور شغفِ علمی کا ایسا جوہر پیدا ہو گیا جسکی وجہ سے انکی تعلیم کے سالانہ نتائج سرمایہ داروں کے لڑکوں کے نتائج سے بدرجہا بہتر ثابت ہوئے،

تعلیم کی عام اشاعت روس کے وزیرِ تعلیم یا ان کے الفاظ میں "کمشنر تعلیم" "روس کے مشہور ادیب لوناخرسکی" ہیں، انھوں نے اپنے صیغۂ تعلیم کے لیے ایک ایسا دستور العمل مرتب کیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے مطابق عمل ہوا تو روس میں ١٩٢٨ء تک جہل کا خاتمہ ہو جائے گا، انھوں نے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے ابتدائی کتابیں تالیف کیں، اور یہ کتابیں کئی لاکھ کی تعداد میں روس کے مدرسوں میں بہت جلد تقسیم ہو گئیں، اس طریقۂ کار کا فوری نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ ١٩٢١ء میں ساٹھ لاکھ روسی معمولی نوشت و خواند سے واقف ہو گئے، کہ یکایک ١٩٢١ء میں روس میں عام قحط پڑا، اس قحط نے تعلیمی نظام کو سخت صدمہ پہنچایا کیونکہ تمام کام کرنے والے اپنے مشاغل چھوڑ کر اس قحط کے انسداد میں حکومت کے شریکِ کار ہو گئے،

مدرسوں کے حالات وہاں کے مدارس کے نصابِ تعلیم میں علمی رنگ بہت غالب رکھا گیا ہے، مدارس چند اصول کے ماتحت چلتے ہیں، اس کے ابتدائی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ طلبہ کو جسمانی سزا مطلق نہ دی جائے، اس اصول کی نہایت سختی سے پابندی کیجاتی ہے، کسی سخت سے سخت جرم کی سزا میں بھی بید سے کام نہیں لیا جاتا

اور وہاں کے مدارس میں ایک اور یہ جدت بھی ہے، عام ازین کہ یہ فی الواقع اصولِ معاشرت سے صحیح ہو یا نہ ہو کہ لڑکے اور لڑکیاں خواہ صغیر سن ہوں، یا عہدِ شباب میں ایک ہی مدرسہ میں ایک ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، اسلیے وہاں دوسرے ممالک کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے لیے جدا جدا مدارس قائم نہیں ہیں، جس سے نظامِ تعلیم میں ایک حد تک سہولت پیدا ہوتی ہے، وہاں کے مدارس میں ایک دوسری شے یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ طلبہ کو ابتدائے عمر سے اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے، وہ اپنی تعلیم کے لیے خود بطیب خاطر مضامین منتخب کرتے ہیں، انھیں جو مضامین طبعًا ناپسند ہوں ان کے پڑھنے پر وہ مجبور نہیں کیے جاتے اور اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ان کے ذریعہ سے ان کے مدرسوں کے نظام کو ایک حکومت کی شکل میں مرتب کرایا جاتا ہے اور اس "نظامِ حکومت" کے تمام اعضا خود طلبہ ہوا کرتے ہیں، اس طرح آیندہ چلکر حقیقی نظامِ حکومت کے سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے، اس وقت یونیورسٹی کے تمام طلبہ کی تعداد ملین لاکھ تک پہنچ گئی ہے، طلبہ کی یہ تعداد عہدِ زار کے طلبہ سے کئی گنا زیادہ ہے،

طلبہ کا شغف علمی فاضل امریکن سیاح روسی طلبہ کے شغفِ علمی کو ظاہر کرتے ہوئے، لکھتا ہے: "میں ایک دن ماسکو یونیورسٹی کے ایک کتب خانہ میں گیا، میں نے وہاں دروازے تک کی آخر آخر نشستوں کو بھرا ہوا دیکھا، وہاں طلبہ کو جنمیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تھے کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے زمین پر بیٹھے ہوئے پایا، کیونکہ وہاں کے کتب خانوں میں ہمارے امریکہ کے کتب خانوں جیسا نظام نہیں ہے، وہاں جو طلبہ بیٹھے ہوئے نہایت مستعدی سے مطالعہ میں مصروف تھے یا جو مختلف مسائل علمی کے حاصل کرنے کے لیے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ کتب خانہ کے آنے جانے والوں کی عام گفتگو یا عجلت کے لیے لوگوں کا اصرار سے کتابیں مانگنے میں ہنگامہ کرنا ان کی مصروفیت میں خلل انداز نہیں ہوتا، یہ ہیں آج کل کے روسی طلبہ؛ اور یہی ہیں وہ حالات جو ان طلبہ اور عہدِ زار کے طلبہ میں باعثِ امتیاز ہیں،

فوجی مجالس اور تعلیم بالشویکوں کے لیے چند فوجی مجالس کا وجود نہایت مغتنم ثابت ہوا، انھوں نے ان مجالس

کی حوصلہ افزائی کی، اور ان مجالس کے ممبروں میں اشاعتِ تعلیم کے لیے ان مجالس سے مدرسوں کا الحاق کر دیا، کہا جاتا ہے کہ ان ممبروں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی ان کے لیے محاضرات میں کتابیں لکھی گئیں اور نیز مختلف قسم کے ڈرامے تیار کرکے تقسیم کیے گئے، اس طریقۂ کار سے وہ بہت زیادہ مستفید ہوئے اور انھوں نے بہت جلد علمی معلومات کا کافی ذخیرہ حاصل کر لیا،

اشاعت تعلیم سے بالشویکوں کا مقصد بالشویک روس میں اس عام تعلیم کی نشر و اشاعت سے چند مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، اولًا وہ چاہتے ہیں کہ روس میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی ایک جماعت پیدا ہو جائے، دوسرے وہ مزدوروں کے ایک ایسے گروہ کے خواہشمند ہیں جو اپنے علمی معلومات کے ذریعہ سے کارخانوں اور زراعت کی ضروریات پوری کر سکیں، جس سے روس میں اقتصادی ترقی کا حصول ممکن ہو، اور ان سب سے بالاتر یہ کہ وہ تمام باشندگانِ روس میں ایک علمی روح پیدا کر دینے کے خواہاں ہیں،

اسلام اور اصول حکومت،

ان دنوں مصر میں وہاں کے ایک قاضی شیخ علی عبدالرزاق ازہری کی ایک کتاب پر جو انھوں نے اصولِ حکومت پر لکھی ہے، اور جس میں انھوں نے اسلامی سیاسیات پر بحث کی ہے سخت اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور بعض لوگوں نے اس تصنیف کو احکامِ شرع کے خلاف ٹھہرایا ہے، ٹائمز (لندن) اپنے ادبی ضمیمہ میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

۱۲ اگست ۲۵ء کو ۲۴ علما کی ایک مجلس نے جامع ازہر کے استاد اصولِ فقہ اور اس کتاب کے مصنف پر ارتداد کا الزام لگا کر ان کو استاذی کے درجہ سے الگ کر دیا ہے، اس کتاب کا جو اثر مسلمانوں پر ہوا ہے اسکو سمجھنے کے لیے ہم کو یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے مذہبی تعلیم ایک ضروری شے ہے، کیونکہ ہر مسلمان کو جو صحیح اسلامی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو، روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ قرآن مجید، احادیث، اور اصول اسلام کے لیے وقف کرنا پڑتا ہے، اسلیے ہر مسلمان کو اپنے مذہبی اصول سے کچھ نہ کچھ واقفیت ہوتی ہے،

اسلیے جو شخص بھی ان بنیادی اصول کے خلاف کچھ لکھیگا اوسے نہ صرف علمار کا مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ اوسے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں سے باہم دست وگریباں ہونا پڑے گا، اسلیے اس میں دونوں پہلو موجود ہیں، وہ فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور نقصان بھی،

شیخ علی عبد الرزاق یقیناً ایک سچے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں، وہ اسلام کے دونوں بنیادی اصول توحید باری تعالیٰ اور پیغمبر اسلام صلعم کے قائل ہیں، وہ قرآن مجید کو وحی اور کلام الٰہی مانتے ہیں، جہاں کہیں بھی وہ موجودہ مذہبی تعصب کے خلاف اظہار خیال کرتے ہیں، اس مسئلہ کو قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسلامی احکام تمامتر قرآن واحادیث پر مبنی ہیں، مسئلہ خلافت کا انحصار تمامتر صرف احادیث پر ہے، قرآن مجید میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ہے، شیخ علی نے جو چیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل باتیں نہ تو قرآن ہی میں ہیں اور نہ مستند صحیح احادیث میں،

(۱) رسول اللہ صلعم حضرت عیسیٰ یا حضرت موسیٰ علیہما السلام سے کسی صورت سے بھی دنیاوی حکومت کے زیادہ حامی یا متمنی تھے، (۲) رسول اللہ صلعم نے مذہبی احکام واعمال کے علاوہ کوئی مزید تعلیم نہیں دی، اور نہ دینی چاہی، ان کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی حیات میں دنیاوی حکومت کے متعلق ہدایات واحکامات تو درکنار خود اپنے جانشین (خلیفہ) کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا تھا، شیخ کا بیان ہے کہ قرآن کی اس آیت کا جو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، جس مسئلہ پر خلافت کے سلسلہ میں اس قدر زور دیا جاتا ہے اس مسئلہ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے مطابق ہے، کہ "قیصر کو وہ دو جو قیصر کا ہے" اسلیے یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ خاتم النبیین تھے، اور آپ کے بعد کسی نے کوئی پیغام الٰہی پیش نہیں کیا اور آپ نے مذہبی احکام کے علاوہ کچھ اور نہیں فرمایا، ایک مسلمان کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ کفار ومشرکین میں حکومت کے متعلق جو بہتر چیز ہو اُسے اختیار کرے، اس سے شیخ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو عہد موجودہ کی ترقیوں میں مساویانہ حصہ لینے سے کوئی چیز نہیں روکتی اور اسکو واضح طور سے یوں

سمجھئے کہ شیخ اپنے ہم مذہبوں کے سامنے اپنے الفاظ میں وہ نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جو ترکوں نے ایک حد تک عملاً پیش کرنا شروع کیا ہے،

تاریخ اسلام میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی جن جن لوگوں نے اپنے عہد کے علمار کی تعلیمات کی سخت تنقید کی ہے، شیخ موصوف انھیں میں سے ایک ہیں، لیکن بعض مخصوص اسباب کی بنا پر ان کی تصنیف کا خاص اثر ہو رہا ہے، ان کو مسند تدریس وعدالت سے الگ کر دیا گیا ہے، اس سے بھی کوئی زیادہ اہمیت پیدا نہ ہوتی، مگر جامع الازہر سے ان کو ہٹا کر اس مسئلہ کو ایک سیاسی رنگ دیدیا گیا، دوسرا سبب یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق ترکوں نے اس منصب کو موقوف کرکے جو حالت پیدا کر دی تھی اس کے بعد ہی یہ کتاب شائع ہوئی،

ہمارا خیال ہے کہ شیخ کے پیرووں کی بڑی جماعت موجود ہے، اگر دنیائے اسلام نے ان کی نصیحت پر عمل کیا تو وہ بہت سی الجھنوں سے آزاد ہو جائیگی، ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیے کہ حال ہی میں اسی موضوع پر دو اور کتابیں شائع ہوئی ہیں، ایک سر آرنلڈ کی "خلافت" اور دوسرے پروفیسر گلیوم کی "احادیث فی الاسلام"

اوپر کی سطروں میں ناظر نے مسلمانوں کو موجودہ الجھنوں سے نجات پانے کے لیے جو تدبیر بتائی ہے، وہ اصلی حال ہے جسمیں یورپ مسلمانوں کو پھنسانے کے لیے مصروف ہے، دو چیزیں ہیں، ایک اسلام اور اسکے احکام، دوسرا جدید علم وتمدن، اب مسلمان دو فرقوں میں منقسم ہیں ایک قدیم خیال اشخاص کا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر نیا علم، نیا فلسفہ، نیا تمدن مذہب کا دشمن ہے، اسلیے ان سب سے بچنا چاہیے، دوسرا فرقہ جو یورپ کی تعلیم وتمدن سے متاثر ہے، اس کے نزدیک موجودہ عہد میں ترقی کی صرف ایک ہی صورت ہے جو ایرانی طالب اصلاح تقی زادہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ "فرنگی مآب شوید" ہم کو ہر رنگ اور ہر طریق سے یورپین ہو جانا چاہیے، پہلا فرقہ جدید علم وتمدن کے منافع اور ضروریات سے ناواقف ہے اور دوسرا مذہب سے بیخبر ہے، اور اسی لیے دنیائے اسلام میں یہ ابتری اور یہ کشاکش ہے، علامہ شبلی مرحوم کا نظریہ یہ ہے کہ ہمکو ان دو چیزوں سے واقف ہو کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مذہب کے اصلی عناصر اور حقیقی احکام کیا ہیں، انکو قبول کرنا چاہیے، اور جدید علم وتمدن کے خلاف مذہب اور مضر پہلو کیا کیا ہیں، اون سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اس طرح حقیقی مذہب اور حقیقی علم وتمدن میں مصالحت ممکن ہے،

ایکہ پرسی کہ دریں کار چہ تدبیر بود، دین ودنیا ہمہ آمیز کہ اکسیر بود،

اخبار علمیہ

باشندگان امریکہ کی ایک نمایاں خصوصیت، امریکن اشخاص کے طرزِ زندگی میں "عجلت" ایک نمایاں خصوصیت ہے، جو انھیں دوسرے ممالک کے باشندوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ جس کام میں ہات لگاتے ہیں اسے جلد از جلد اتمام تک پہنچانا چاہتے ہیں، امریکہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو ٹھہر ٹھہر کر چلنے کا عادی ہو، اسلیے تمام روئے زمین پر جتنے موٹر کار موجود ہیں، امریکہ میں انکی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، انکی عجلت کی یہ انتہا ہے کہ اگر انھیں کسی شہر کی تعمیر کی ضرورت ہوگی تو اوسکی بنا ڈال کر اسے جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے، چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے کہ صوبہ واشنگٹن میں ایک نئے شہر کی تعمیر کی رائے قرار پائی، جسے اب لونگ وبو کہتے ہیں، سنہ ۱۹۲۵ء بھی نہ آنے پایا تھا کہ صرف دو برس کے اندر شہر کی تعمیر کے بعد سات ہزار آدمی وہاں سکونت پذیر ہوگئے، باشندوں کی دلچسپی کے لیے ایک تھیٹرہال بھی قائم ہوگیا جس کا مجموعی خرچ پچاس ہزار ڈالر ہے، اور اسی اثنا میں اس شہر کے مکانوں کی تعداد ۴۰۰۰ تک پہنچ گئی، نیز وہاں ایک شش منزلہ ہوٹل کھل گیا، جس میں ۲۰۰۰ اشخاص کے رہنے کی گنجائش ہے، اور ان سب سے زیادہ عجیب وغریب یہ ہے کہ اسی مدت میں وسطِ شہر میں ایک نہایت خوبصورت باغ بھی لگا دیا گیا، جو شہر کے لیے باعثِ رونق اور باشندوں کے لیے تفریح گاہ ہے،

آواز کا فوٹو، ایجاد و اختراع نے اب ایک قدم اور آگے بڑھایا، پہلے اگر بولنے والوں اور گانے والوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ گراموفون کے ریکارڈ میں مقید کیے جاتے تھے تو اب یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جدید اختراع شدہ آلہ سے آواز کا فوٹو بھی اوتار لیا جائے، یہ جدید آلہ ممالک متحدہ امریکہ کی بو دائن یونیورسٹی میں ایجاد ہوا ہے، اس آلہ کا سب سے اہم جزو ایک آئینہ ہے جو انسان کی آواز اور اسکی تموج کی حرکتوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ

حرکت کرتا ہے، اور اسی آئینہ کی حرکت فوٹو گرافی کے آلہ پر جس میں سینما کے فلم جیسا ایک فلم ہوتا ہے اثر ڈالتی ہے اور اس طرح اسی فلم پر آواز کے پیچ وخم کا فوٹو کھنچ جاتا ہے،

انگریزی خواتین معزز عہدوں پر، انگلستان میں خواتین کی روز افزوں علمی و تعلیمی ترقی روز بروز مردوں سے ان کے عہدے خالی کرا رہی ہے، وہ رفتہ رفتہ ملازمت کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگی ہیں، چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں مسز الیس نے جانوروں کے علاج کرنے کی سارٹیفکٹ حاصل کی اور مسز ولیمز نے اسی سال وکالت کی سند پائی، سنہ ۱۹۱۲ء میں مسز کوسماں شہر نوریٹش کی افسر اعلیٰ مقرر ہوئیں، ناظرین کے لیے ذیل کے اعداد وشمار دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے جنھیں انگلستان کی عورتوں کے موجودہ منصبوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے:-

عہدے	تعداد	عہدے	تعداد
شہروں کے افسران اعلیٰ	۶	جج	۸۹۵
میونسپلٹیوں کی ممبر	۲۲۶	میونسپلٹیوں کے اعلیٰ افسروں کی مجلسوں کی ممبر	۷۰
دوسری نیابتی مجلسوں کی ممبر	۱۱۹	،	

بیس ہزار سال کی ایک قبر، یوگوسلافیہ کے ایک گاؤں بڑنوموسٹ میں مٹی کے برتن بنانے کے لیے ایک کمپنی قائم تھی، اس کمپنی نے ایک جگہ ایک قبر کا اکتشاف کیا جو کشتی کے مانند ہے، قبر کو کسی چیز سے بنانے کے بجائے پتھر کی سلوں سے ڈھک دیا گیا تھا، جب پروفیسر البسولون نے اس قبر کی تحقیقات کی تو انھیں اس میں انسانوں کی بیس کھوپڑیاں ملیں جنمیں سے ۱۲ کھوپڑیاں جوان مردوں اور ۸ چھوٹے بچوں کی ہیں،

پروفیسر موصوف کا قیاس ہے کہ یہ بیس ہزار سال کی قبر ہے، انھوں نے اس قبر میں ایک چھوٹی گردن کے نزدیک چھوٹا سا ہار بھی پایا ہے، اس اکتشاف میں سب سے زیادہ عجیب وغریب یہ ہے کہ یہ کھوپڑیاں

ہماری کھوپڑیوں سے چھوٹی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض ہماری کھوپڑیوں سے بھی بڑی ہیں، اور ان کے دانت ہمارے دانتوں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور منھ کے اندر زیادہ گھسے ہوئے ہیں،

تمام عالم میں پٹرول کا خرچ، تمام دنیا میں پٹرول کا خرچ روز افزوں ترقی پر ہے، لیکن اس کا مصرف تمام اطراف عالم میں کسی ایک مقررہ اصول پر مبنی نہیں، کیونکہ ۱۹۱۳ء میں ساری دنیا میں جسقدر پٹرول صرف ہوا، اس کا چوتھائی حصہ صرف یورپ کے حصہ میں ہے، پھر ۱۹۲۰ء میں اسی یورپ میں ۱۹۱۳ء کے تناسب سے پندرہواں حصہ بھی خرچ نہ ہوسکا، ولایات متحدہ امریکہ میں اسکا خرچ سب سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ تمام دنیا میں جس قدر پٹرول صرف ہوتا ہے اس میں ۷۰ فیصدی صرف امریکہ کا حصہ ہے،

ذیل میں ۱۹۲۴ء میں پٹرول کے خرچ کا شمار دیا جاتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ تمام اطراف عالم میں پٹرول کے لاکھوں پیپے کا صرف کس تناسب سے ہے:-

روایات متحدہ امریکہ	۷۱۸	لاکھ	پیپے
میکسیکو	۱۴۵	"	"
روس	۴۹	"	"
ایران	۳۰	"	"
جزائر ہند مقبوضہ ہالینڈ	۱۵	"	"
رومانیہ	۱۳	"	"
ونزویلا	۸٫۲	"	"
پیرو	۵٫۳	"	"
ہندوستان	۷٫۵	"	"
پولینڈ	۵	"	"
بورنیو	۴٫۵	"	"
ارجنٹائن	۳٫۵	"	"
دوسرے ممالک	۸٫۷	"	"
مجموعہ	۱۰۱۳	لاکھ	پیپے

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ اسلام

از مولوی ابو الجلال صاحب ندوی،

جناب مولوی اکبر شاہ صاحب نجیب آبادی سے ناظرین معارف روشناس ہیں، وہ تاریخ سے خاص ذوق رکھتے ہیں، اور اکثر اسی کا مطالعہ رکھتے ہیں، اور اسی کی تحقیقات اور غور و خوض میں وقت صرف کرتے ہیں چنانچہ یہ کتاب بھی انکی اسی فطری کا نتیجہ ہے،

یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے باب میں عہد رسالت سے پہلے کی عربی تاریخ اور دیگر ممالک کا اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں عہد نبوت، تیسرے باب میں خلافت شیخین، چوتھے باب میں حضرت عثمانؓ حضرت علی اور خاتم الخلفا امام حسن رضی اللہ عنہم کی امارت تک کے حالات ہیں، ان ابواب کے علاوہ ایک مختصر مقدمہ بھی ہے، جس میں نفس سلطنت کی تاریخ اور جمہوری اور شخصی حکومتوں کے نقصانات اور فوائد سے بحث کیگئی ہے،

اس کتاب کی تالیف میں مؤلف نے کافی محنت اٹھائی ہے، مگر خدا جانے کیوں وہ اپنے مطالعہ کی کتابوں کو پردۂ راز میں رکھنا چاہتے ہیں، ساری کتاب میں کہیں بھی اپنے ماخذوں کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کسی موقع پر کسی واقعہ کے متعلق کوئی حوالہ دیا ہے، شاہ صاحب کو غور کرنا چاہیئے کہ ان کی اس فروگذاشت کا اثر اس کتاب کے اعتماد پر کیا پڑے گا،

افسوس ہے کہ ہمکو اس کتاب کی ستائش کے ساتھ ساتھ جناب مصنف کی کچھ خوردہ گیری بھی کرنی پڑتی ہے، شاہ صاحب نے مستعرب عربوں کے بیان میں فرمایا ہے کہ،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مادری زبان عجمی یا فارسی تھی،

کاش شاہ صاحب نے اس عجیب وغریب دعوی پر کوئی سند پیش کی ہوتی تو ہم روایت کے درجہ کے متعلق یقیناً کوئی صحیح رائے قائم کر سکتے، غالباً شاہ صاحب کو غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ کسی موقع پر آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان کے متعلق عجمی کا لفظ پایا ہوگا اور چونکہ معلوم ہے کہ عرب کے مورخین حضرت ابراہیمؑ کا اصلی وطن کوثی، حران، یا ہرمز جرد وغیرہ ان مقامات میں بتاتے ہیں جو عہد اسلام سے قبل ایران کے ماتحت تھے اس بنا پر قیاس فرمالیا گیا کہ یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مادری زبان فارسی ہوگی، مگر یہ قیاس قطعاً غلط ہے، کوئی روایت اسکی تائید نہیں کرتی، بلکہ طبقات ابن سعد میں تو صحیح سند کیساتھ حضرت ابن عباسؓ سے مذکور ہے کہ

"حضرت ابراہیمؑ نے جب کوثی سے ہجرت کی تو انکی زبان سریانی تھی، آپ نے جب حران سے فرات کو پار کرلیا تو خدا نے آپ کی زبان بدل دی، اسی عبور فرات کی مناسبت سے اس جدید زبان کا نام (جسکو حضرت ابراہیمؑ نے بعد ہجرت اختیار کیا) عبرانی پڑا، نمرود نے آپ کے پیچھے جن لوگوں کو چھوڑا تھا ان کو حکم دیا تھا کہ جو شخص سریانی بولتا نظر آئے اس کو پکڑ لاؤ، ان لوگوں کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی لیکن آپ نے عبری میں گفتگو کی، اسلیے چھوڑ دیا"۔

یہی روایت قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ یقیناً بنو سام سے ہیں، اور بنو سام کی قدیم ترین زبان کا نام عربوں کی زبان میں "سریانی" ہے جبتک آپ وطن میں تھے سریانی بولتے تھے وطن چھوڑنے کے بعد آپ نے فرات پار کی زبان اختیار کی، حضرت ابراہیمؑ کا فارسی بولنا کہیں سے ثابت نہیں،

شاہ صاحب نے تاریخ اسلام میں بحیرا راہب کے واقعہ کو بھی درج کیا ہے، حالانکہ ناقدین فن علمائے سیرت نے بدلائل اس کو غلط ثابت کیا ہے، اگر واقعہ شاہ صاحب کی نظر میں صحیح ہے تو اس کے دلائل لکھنا بھی ضروری ہیں اسی طرح آپنے بغیر حوالہ دوسرے سفر شام میں نسطورا راہب سے حضور صلعم کی ملاقات کا قصہ بھی درج کیا ہے اس قسم کے واقعات کے لیے حوالہ کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے ظاہر ہے،

افسوس یہ ہے کہ شاہ صاحب کے انداز بیان نے واقعہ کو اور بھی تعجب انگیز بنا دیا ہو فرماتے ہیں کہ

"نسطورا نے آنحضرت صلعم کو دیکھا تو اپنے صومعہ سے بعض کتب سماویہ لے کر آیا . . . . کبھی آپ کو دیکھتا کبھی کتب سماویہ کو پڑھتا،

حالانکہ کتب سیر میں جو کچھ منقول ہے وہ یہ ہے کہ راہب نسطورا نے آنحضرت صلعم کے شریک سفر میسرہ سے آپ کے حالات دریافت کئے، اور سب علامات سنکر آخر میں اس نے کہا کہ "اس درخت کے نیچے کبھی کوئی غیر نبی نہیں اترا، یہ شخص یقیناً نبی موعود ہے"، ہم کو کوئی ایسی روایت معلوم نہیں جسمیں مذکور ہو کہ راہب نسطورا "کبھی آپ کو دیکھتا کبھی کتب سماویہ کو پڑھتا"، بہرحال نسطورا راہب سے ملاقات کا واقعہ بھی محض افسانہ ہے، اس واقعہ کی صحت کا دار و مدار موسٰی بن شیبہ پر ہے، ابن سعد، واقدی، اور محمد بن اسحاق سب نے اس روایت کو انہی سے لیا ہے، کتب رجال میں انکو ناقابل اعتماد اور منکر الحدیث قرار دیا گیا ہے، موسٰی بن شیبہ سے پہلے کے رواۃ بھی معروف نہیں، عمیرہ، ام سعد بنت الربیع، نفیسہ بنت منبہ میں سے کوئی بھی معروف نہیں، ایسی حالت میں روایت کا جو پایہ ہے ظاہر ہے، بالفرض یہ سب لوگ ثقہ سہی لیکن نفیسہ نے اس روایت کو حضرت ابوطالب سے بیان کیا ہے، کیا نفیسہ کی ملاقات حضرت ابوطالب سے ممکن بھی ہے؟

ان خوردہ گیریوں کے باوجود ہم شاہ صاحب کی اس خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تاریخ اسلام پر ایسی جامع و مفصل کتاب کی ضرورت ہے اور اسی قسم کی کتابیں اس ضرورت کو پورا کر سکتی ہیں، حصہ دوم کے متعلق ہم مشورہ دینگے کہ اس میں کم از کم اہم واقعات کا ضرور حوالہ دینا چاہیئے، اور تنقید واقعات میں دقت نظر سے زیادہ کام لینا چاہیئے، اگر ہمارے اس مشورہ پر عمل کیا گیا تو انشاء اللہ اس سلسلہ کی دوسری جلدیں قابل استناد ہونگی، اس کے بعد ہم کو صوفی صاحب سے بھی کچھ عرض کرنا ہے،

یہ کتاب کتابی تقطیع پر ۳۰۰ صفحات میں ہے اور ہر صفحہ ۲۲ سطروں کا مجموعہ ہے، اسکی وجہ سے خط باریک ہو گیا ہے۔ لکھائی اور چھپائی نہ تو کتاب کی اہمیت کے موافق ہے نہ صوفی کمپنی کے وقار کے مطابق، تاریخ اسلام شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک خاص چیز ہے، مگر مطبع نے ان پر جو ظلم کیا ہے اس نے بہت کچھ کتاب کی قدر و قیمت میں کمی

کردی، ہم صوفی کمپنی کے مالکان سے درخواست کریں گے کہ ہر کتاب کی لکھائی چھپائی اتنی صاف واضح، اور جلی تو ضرور ہوتی چاہیئے کہ ہر عمر کا آدمی باسانی پڑھ سکے اور محض طباعت کی خرابی سے قارئیں کی طبیعت اکتا نہ جائے، قیمت :- فی جلد ۱۲؍ غیر مجلد ۸؍، صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین لاہور سے طلب کیجئے ،

آسی،

از عبد السّلام صاحب ندوی ،

حضرت مولانا شاہ عبد العلیم صاحب آسی ایک صوفی منش بزرگ تھے، اور زیادہ تر صوفیانہ رنگ کے اشعار کہتے تھے، وہ اگرچہ متاخرین شعرا میں داغ، جلال، اور امیر کی سی عام شہرت حاصل نہ کر سکے، تاہم نواح پورب مثلاً غازیپور، گورکھپور، بنارس، اور بلیا وغیرہ میں ان کے کلام نے خاص طور پر ایک عقیدت آمیز شہرت حاصل کی تھی، چنانچہ ان کا دیوان ۱۳۱۷ھ میں گورکھپور سے شائع ہو چکا ہے، اور مولٰنا سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپوری کے پاس بھی ان کے کلام کا بہترین ذخیرہ موجود ہے جسکی طباعت میں وہ کوشاں ہیں، لیکن مولوی سید یامین صاحب ہاشمی ام لے، ال ال بی وکیل غازیپور نے انکی نظموں کا ایک جدید مجموعہ نئے طرز پر مرتب کر کے شائع کیا ہے، جسکا نام آئی ہے، وہ خود معترف ہیں کہ وہ اس ایڈیشن میں آسی کے سوانح پر روشنی نہ ڈال سکے، اسلیے اگر آسی کے بجائے اس کا نام "نظم آسی" ہوتا تو غالباً زیادہ موزوں تھا، بہرحال انھوں نے اس مجموعہ میں سب سے پہلے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں مختلف عنوانات میں اونکی شاعری پر بحث کی ہے، لیکن ان عنوانات میں کسی قسم کا تصنیفی تناسب نہیں پایا جاتا، کیونکہ بعض موقعوں پر نہایت اختصار سے اور بعض موقعوں پر غیر ضروری اطناب سے کام لیا ہے، مثلاً ایک عنوان میں آسی کا انداز بیان یہ بتایا ہے کہ "الفاظ تھوڑے لیکن معانی بہت زیادہ" اور اسکی مثال میں صرف دو شعر نقل کئے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی تشریح نہیں کی ہے کہ وہ معانی کثیرہ کیا ہیں جو ان تھوڑے سے الفاظ میں آگئے ہیں، اس کے بعد تلمیحات کا ایک عنوان قائم کیا ہے، اور تلمیحات کے مختلف اقسام بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ غالب

کو تلمیحات کے استعمال میں کمال تھا اور حضرت آسی بھی اس کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، لیکن مثال میں صرف تین شعر نقل کئے ہیں جنہیں کوئی نئی تلمیح نہیں ہے، وہی کوہکن اور موسٰی کا نام حضرت آسی نے بھی لیا ہے جو کتب شاعری کے ایک طفل ابجد خوان کو بھی از بر ہیں، ایک عنوان موسیقی کا قائم کیا ہے، اور ایک تمہید کے بعد لکھا ہے کہ آسی کے اشعار کسی اور ہی قسم کی موسیقی پیش کرتے ہیں، الفاظ رقصاں ہیں، جملے جھومتے ہیں، لیکن مثال میں ایک خاص بحر کے چند شعر پیش کئے ہیں مثلاً

غمزے ہیں جنہیں حسن کے عشق ہے اوس نگار کا ۔ چوٹ ہے جس میں عشق کی حسن ہے میرے یار کا

لیکن اس قسم کی بحروں میں تمام شعراء نے غزلیں لکھی ہیں، اسلیے اگر اوس میں موسیقیت ہے تو یہ صرف آسی کا بلکہ کسی شاعر کا کمال نہیں ہو سکتا، اگر کمال ہے تو موجد بحر کا ہے،

فطرتی شاعری کے عنوان میں مولانا آسی کو اصلی معنوں میں شاعر تسلیم کیا گیا ہے، لیکن مثال میں صرف دو شعر نقل کئے ہیں، اور یہ نہیں بتایا ہے کہ ان میں کن فطرتی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے،

ایک عنوان قائم کیا ہے "حضرت آسی اور تعلیم قرآن" اور اس میں اگرچہ بہت اختصار سے کام نہیں لیا ہے بلکہ متعدد اشعار نقل کئے ہیں جنمیں قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، لیکن حضرت آسی ہی کی تخصیص نہیں، بلکہ اردو کے بہت سے شعراء کے کلام میں اس قسم کی مثالیں ملسکتی ہیں، انھوں نے تلمیحات کے عنوان میں تلمیح کی ایک قسم یہ کی ہے کہ "وہ جسکا تعلق مذہبی عقائد اور قصص کے ساتھ ہے" اسلیے اگر ان اشعار کو مذہبی تلمیحات کی مثال میں درج کرتے تو بہتر ہوتا، اور آسی کی تلمیحات اردو کے عام شعراء سے ممتاز ہو جاتیں،

ان عنوانات کے بعد فلسفۂ تصوّف کے عنوان سے تصوّف کی تاریخ پر ایک طویل بحث کی ہے، اور اگرچہ اونکے دل میں یہ طوالت بیانی خود کھٹکی ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ :-

ممکن ہے کہ ایک معترض اس طویل تمہید کو دیکھ کر مجھے ایک متحذلق کہہ بیٹھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ تو میرا مطلب اظہار علمیت ہے اور نہ اعلان قابلیت (بلکہ) میرا ارادہ ہے کہ میں (انشاء اللہ)

آیندہ صفحات میں تصوف کے تمامی مراحل و لطائف کا ذکر مولانا آسی کی شاعری کے سلسلہ میں کر دن

اس کے بعد مولانا آسی کی صوفیانہ شاعری سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ میر درد، آتش، ناسخ، غالب و ذوق سب کے کلام میں تصوف کی اصطلاحات موجود ہیں، لیکن ان مصطلحات کا استعمال صرف اس وجہ سے تھا کہ بغیر چاشنی تصوف جذبات کا اظہار ممکن نہ تھا، لیکن ان میں آتش و ناسخ تو شیعہ ہیں جو انھیں کے الفاظ میں "بوجہ عقیدہ مذہبی تصوف کے منکر ہیں، ذوق کا کلام بھی تصوف کے آب و رنگ سے خالی ہے، لیکن اون کے علاوہ تمام دلی کا کلام نکات تصوف سے لبریز ہے، درد کی نسبت تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا، اور خود انھوں نے آسی کی طرح غالب کا شعار شاعری ہی تصوف کو قرار دیا ہے،

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر

میر اگرچہ اپنے تغزل میں مشہور ہیں، لیکن ان کے کلام میں بھی تصوف کے مسائل بکثرت ملتے ہیں، انھوں نے آسی کے کلام سے جو صوفیانہ مثالیں پیش کی ہیں وہ بھی ایسی نہیں جو اور شعرا کے کلام میں نہ مل سکیں، اس کے ساتھ تمہید میں تصوف کے جو تاریخی سلسلے اور ان کے مسائل بیان کئے ہیں، کلام آسی سے ان کے مطابق اشعار بھی نقل کئے ہیں، بعض مثالیں ممثل لہ سے مطابق بھی نہیں، مثلاً ان اشعار کو تزکیۂ نفس سے کیا تعلق ہے؟

صلاحیت بھی تو پیدا کر اے دل ناداں — پڑے ہیں نقش کف پائے یار پتھر پر

اگر یہ دل کو چاہو تم کہ منزل گاہِ دلبر ہو — تو جو ہو غیر تم ہو تا کہ غیر اس گھر کے باہر ہو

مولانا آسی کی اخلاقی شاعری کے سلسلے میں بھی ایک طویل تاریخی تمہید لکھی ہے، لیکن اون کے کلام سے جو اخلاقی اشعار انتخاب کئے ہیں، وہ بھی وہی اردو شاعری کے عام عنوانات ہیں، مثلاً توکل اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ

بہر حال شعر العجم حصہ پنجم کو سامنے رکھکر انھوں نے آسی کے کلام پر نظر ڈالی ہے، لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اردو شاعری کی تاریخ نہیں لکھتے بلکہ کلام آسی پر ریویو لکھتے ہیں، اسلئے اس قسم کے تاریخی مباحث اس مقدمہ میں غیر ضروری اور متجاوز عن الحد تھے،

ان تمام مراحل کے بعد خاص خاص عنوانات کے نیچے آسی کے بکثرت اشعار جمع کئے ہیں جنسے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اشعار کو اسی عنوان سے تعلق ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ متعدد مختلف المضامین اشعار میں سے کسی شعر کے ایک ٹکڑے کو لیکر موجودہ اخباری طرز پر عنوان بنا لیا گیا ہے، مثلاً

خوشبو وہی رنگت وہی مستی بھی اوسی کی — کعبے میں بھی دور مئے میخانۂ دل تھا،

اس سے ایک عنوان قائم کیا ہے "میخانۂ دل" لیکن اس کے بعد جو اشعار ہیں انکو مئے و میخانہ سے کوئی تعلق نہیں، ایک عنوان قائم کیا ہے "طراز گنج اسرار" اور اس سلسلہ میں بہتیرے اشعار نقل کئے ہیں، جن میں صرف ایک شعر میں یہ ترکیب آئی ہے،

نہ جانا کچھ طراز گنج اسرار — امانت دار تھا جاہل ہمارا

بہر حال اگر وہ اس طوالت بیانی کو چھوڑ کر مختلف عنوانات سے مثلاً تصوف، اخلاق اور فلسفہ کے نیچے آسی کے تمام صوفیانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی اشعار جمع کر دیتے تو زیادہ کامیاب ہوتے،

یہ گفتگو تو اس مقدمہ کے متعلق تھی، لیکن آسی کا کلام اس سلسلے سے الگ ہے، اور وہ ایک مفصل تنقید کا محتاج ہے، اسلئے ساتھ ساتھ ہم اس فرض کو بھی ادا کرتے ہیں، اردو شاعری میں اخلاق و تصوف کا جو ذخیرہ ہے، اسکی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جس میں صرف اخلاق و تصوف ہی ہے، شاعری نہیں، شاہ نیاز بریلوی وغیرہ کا کلام اسی قسم کا ہے، دوسرے یہ کہ عاشقانہ غزلوں میں جابجا صوفیانہ اشعار بھی آجاتے ہیں، شعرائے دہلی کا یہی طرز ہے اور یہ طرز انھوں نے متاخرین شعرائے فارسی سے سیکھی ہے، لیکن آسی کے کلام کو ان سب پر مزیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر اخلاق و تصوف کا حصہ پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ شاعرانہ حسن ادا کا سررشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا، مثلاً ایک غزل کے متعدد اشعار میں مسئلۂ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

قطرے میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیے — بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہیے

ایک ہستی کے سوا کچھ بھی نہ جانا ہم نے — اے نکیرین پھر اور اس کے سوا کیا کہیے

ہم کہاں ہم تو ہیں معدوم مگر ہے کوئی   کہدیں کچھ صاف تو ہوتے ہو خفا کیا کہیے
لالہ وگل میں اوسی رشکِ چمن کی ہے بہار   باغ میں کون ہے اے بادِ صبا کیا کہیے

ایک اور غزل میں بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں،

حجابِ گنجِ مخفی میں نہاں تھے   الٰہی ہم کہاں آئے کہاں تھے ؟
بہارِ باغِ ہستی تھی ہمیں سے،   نظر سے گو برنگِ بو نہاں تھے
نہ تھا معشوق جس میں غیر عاشق   عجب خلوت تھی وہ بھی ہم جہاں تھے
اوٹھے ہم اوٹھ گیا پردہ دوئی کا   ہمارے اوس کے بس ہم درمیاں تھے

اسی طرح اون کی غزلیں عرفان و تصوف میں ہیں، بعض غزلوں میں ایک ہی قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، اور بعض میں تصوف کے مختلف مسائل کا بیان ہے، ان غزلوں میں جو اشعار عاشقانہ ہیں وہ بھی نہایت متین، سنجیدہ، اور پر درد ہیں، اور یہ متانت و تہذیب بھی اسی ذوق تصوف کا نتیجہ ہے مثلاً

لذت اک گونہ چاہیئے مجھ کو   کیا وہ دل بھی دکھا نہیں سکتے ؟
اون کو دعوائے یوسفی آسی   خواب میں بھی جو آ نہیں سکتے

جز ہم زباں نہ کوئی ملا قدرداں مجھے   آنکھیں کسی کی کہتی ہیں جادو بیاں مجھے
آغوش میں بھی چاند سی صورت ضرور ہے   رفعت اگر ملی صفتِ آسماں مجھے

وہ کیوں ہمیں حسن کا تقاضا یہی نہ ہے کچھ حجاب میرا   نقاب اوٹھیں وہ بے تکلف کہ مجھ میں تابِ نظر نہیں ہے

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان اشعار میں بھی صوفیانہ اشارے نکلتے ہیں مثلاً

اے وہ خوش آب دریائے وجود   ہجر میں دل ماہیِ بیتاب ہے،
دیکھیے حوریں دکھائی جاتی ہیں،   امتحانِ عاشقِ بیتاب ہے
میری آنکھیں اور جلوہ آپ کا   یا قیامت آگئی یا خواب ہے

اس بنا پر اون کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے،

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ   تو شعر لغو ہے آسی کلام ناکارہ،

الفاظ کی تراش خراش اون کے یہاں کم پائی جاتی ہے، البتہ بعض الفاظ میں انھوں نے تصرفات کئے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ نے "می مردافگن" کی نئی ترکیب پیدا کی تھی، اونھوں نے تصرف کرکے اسکو صوفی فگن، موسیٰ فگن، عاشق فگن کر دیا،

استعارہ و تشبیہ بھی اون کے یہاں کم ہیں لیکن جو ہیں وہ نہایت لطیف ہیں مثلاً

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے   اپنے اوہام ہوئے وادیِ غربت مجھ کو
دلِ پیرِ مغاں میں چاہیئے اے دل ترا گھر ہو   وہ ہے مے نوش جو نورِ نگاہِ چشمِ ساغر ہو
خرامِ ناز بھی سرجوشِ برقِ طور ہے شاید   کسی کا نقشِ پا جامِ مئے موسیٰ فگن کیوں ہو

اخلاقی مسائل میں وہ زیادہ تر تمثیل سے کام لیتے ہیں اور یہ وہی صائب و غنی کا طریقہ ہے جسکی تقلید ناسخ و شاہ نصیر نے کی تھی،

پرایا حق وہ تھا جاتا رہا جو ہاتھ سے تیرے،   یہاں آسیا ناحق کفِ افسوس ملتا ہے،
یہاں شمع آخر آپ رہ جاتا ہے جل بھن کر   کہیں آتش زبانی سے کسی کا کام چلتا ہے،

لیکن اس طرز میں انھوں نے کوئی جدت اور وسعت نہیں پیدا کی ہے،

متانت، سنجیدگی اور ذوقِ تصوف نے اگرچہ ان کے کلام کو شعرائے لکھنو کی طرز سے الگ کر دیا ہے، تاہم کہیں کہیں لکھنویت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً

جوانی گو نہیں پر ناتوانی ہے ضعیفی کی،   ملے جو کوئی چکنی وضع پائے دل سنبھلتا ہے،
درختِ بارور کی طرح پتھر روز کھاتا ہوں   جنونِ نخلِ قدِ یار مجھکو خوب پھلتا ہے،
اُن آنکھوں کی قسم کچھ گرمیِ دل کم نہیں ہوتی   خیالِ جنبشِ مژگاں اگر پنکھا بھی جھلتا ہے،

بہرحال وہ متاخرین کے دور میں ایک ایسے شاعر تھے جو بعض حیثیتوں سے شعرائے دلی و لکھنو میں داخل اور بعض حیثیتوں سے ان سے الگ تھے، اور نواحِ پورب اُنکی ذات پر فخر کرسکتا ہے،

مطبوعاتِ جدیدہ

جلال الدین خوارزم شاہ، ساتویں صدی ہجری میں دولت خوارزمیہ اپنے اوجِ کمال پر تھی کہ یکایک تاتاری سیلاب اُمنڈ آیا، اور علاء الدین خوارزم شاہ کی ان تھک مدافعتوں کے باوجود چنگیزیوں کا کثر حصۂ ملک پر قبضہ ہوگیا، یہانتک کہ علاء الدین نے دشمنوں سے منھ موڑ کر دنیا سے ہمیشہ کے لیے منھ چھپالیا، اسکے بعد زمام سلطنت جلال الدین خوارزم کے ہاتھ میں آئی، اسکی رگوں میں حمایت اسلامی جوش زن تھی، وہ تازہ دم ہوکر اٹھا، اور دشمنوں سے خوب خوب معرکہ آرا ہوا، کہ یکایک خاندانِ شاہی میں نفاق و شقاق کی وبا پھیلی اور علاء الدین کے دو اور لڑکوں نے مختلف حصۂ ملک میں جداگانہ حکومتیں قائم کرلیں، اس سے جلال الدین کی قوت منتشر ہوگئی اور باوجود اسکی سعی پیہم کے تاتاری سیلاب ملک میں روز بروز بڑھتا گیا اور بالآخر اس نے پورے ملک پر چھاکر حکومت خوارزمیہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا، زیر تبصرہ کتاب میں یہی واقعات" ترکی زبان کے ایک سب سے مشہور ادیب نامق کمال بک نے ڈرامہ کے طرز میں بیان کیے ہیں، ڈرامہ، جوش جہاد، حمیت اسلامی اور حب وطن کے جذبات سے لبریز ہے، اور اردو زبان کے مشہور ادیب جناب سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی کے اردو ترجمہ نے زبان کی لطافت اور طرز نگارش میں اور زیادہ پاکیزگی پیدا کردی ہے، سید صاحب کا یہ تحفہ ملک کو مدت کے بعد ملا ہے، مگر گرانقدر ہے، ضخامت چھوٹی تقطیع پر ۳۰۹ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے، قیمت ۱۲؍ منیجر مسلم یونیورسٹی بکڈپو علی گڈہ سے طلب کیجائے،

ترکی زبان، مملکت ترکیہ میں قیام جمہوریہ ترکیہ کے بعد سے ترکوں کو اپنی زبان سے غیر معمولی شغف ہوگیا ہے اور اب مملکت ترکیہ میں تقریباً تمام لٹریچر ترکی زبان میں شایع ہوتا ہے، اسلیے تحریک اتحاد اسلامی کے سلسلہ میں ترکوں سے تعلقات قائم کرنے اور ان کے حالات سے واقفیت تامہ حاصل کرنے کے لیے اب ترکی زبان کی تحصیل ضروری ہوگئی ہے، اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر مولوی علی بہادر خانصاحب سابق اڈیٹر خلافت نے یہ رسالہ لکھا ہے جس میں سب سے پہلے ترکی کے حروف تہجی اور ان کا تلفظ بتایا گیا ہے، پھر باب دوم سے ششم تک "اسم" کے مختلف قسموں کا بیان ہے، باب ہفتم میں "فعل" کی تقسیم کرکے ہر ایک کی جداجدا تشریح کیگئی ہے، پھر "حروف" کا بیان ہے، اس کے بعد ۲۰۴ صفحوں میں خالص ترکی الفاظ بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیے گئے ہیں، اور ایک تعلیق (نوٹ) میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس میں حتی الامکان ترکی کے تمام خالص الفاظ جمع کردیئے گئے ہیں اور اُن کے علاوہ ترکی میں جو الفاظ رائج ہیں وہ عربی اور فارسی کے ہیں، آخر میں چند ضمیمے ہیں، پہلے ضمیمہ میں "حروف" کا بیان ہے، دوسرے میں چند ایسے فقرے جمع کیے گئے ہیں جو روزمرہ استعمال کیے جاتے ہیں، اور تیسرے ضمیمہ میں اخباری زبان کے چند نمونے ہیں اور سب سے آخر چوتھے ضمیمہ میں ترکی طرز تحریر پر ایک مختصر تعلیق لکھنے کے بعد نمونۃً مصطفےٰ کمال پاشا کا ایک خط درج کیا گیا ہے جو مرکزی خلافت بمبئی کے نام آیا تھا، اردو میں ترکی زبان کے متعلق پیشتر جو ایک دو کتابیں لکھی گئی ہیں غالباً ان سے یہ زیادہ بہتر ہے، ضخامت چھوٹی تقطیع پر ۰۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے، قیمت عہ، منیجر اخبار اتحاد بمبئی نمبر ۹ سے طلب کیجائے،

عقائد محمدی، امام متبوع حضرت احمد بن محمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے ایک مختصر رسالہ "عقیدہ اہل السنۃ" میں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی تفصیل اور دوسرے فرق اسلامیہ مثلاً مرجیہ، قدریہ اور معتزلہ وغیرہ کے اصولِ عقائد بیان کرکے انکی تردید کی تھی، مولوی محمد بن ابراہیم صاحب جوناگڈھی نے امام صاحب کے اس رسالہ کو مع ترجمہ کے "عقائد محمدی" کے نام سے شائع کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، حجم مع متن ۴۲ صفحے لکھائی چھپائی اچھی ہے لیکن کاغذ نہایت معمولی لگایا گیا ہے، قیمت ۴ر پتہ مولوی محمد بن ابراہیم صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ اجمیری دروازہ دہلی،

جواہرات، جناب سراج الدین احمد صاحب نظامی نے بچوں کے لیے چند دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھکر "جواہرات" کے نام سے شائع کیا ہے، زبان عام فہم اور بچوں کے لائق ہے، لکھائی چھپائی بھی بچوں کی مناسبت سے

عمدہ ہے، آخر کے چھ صفحوں میں رسالہ کے مشکل الفاظ جمع کرکے انکی تشریح کیگئی ہے، حجم چھوٹی تقطیع پر ۱۶ صفحے، قیمت ۵ر پتہ:۔ شیخ غلام علی صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور،

گوتم بدھ، قرآن مجید کی آیت "مامن امۃ الاخلا فیھا نذیر" کو پیش نظر رکھکر مہاتما گوتم بدھ کا "مصلحین امت" میں ہونے کا نظریہ ایک حد تک مانوس ہوتا جاتا ہے، منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے نے اسی مطمح نظر کے ساتھ زیر تبصرہ رسالہ میں مہاتما کے سوانح حیات اور انکی تعلیمات کا خلاصہ درج کیا ہے، شاید اردو میں کسی مسلمان کے قلم سے یہ مضمون پہلی دفعہ ادا ہوا ہے، ضخامت ۳۲ صفحے، کتابت و طباعت متوسط اور کاغذ معمولی ہے، قیمت ۴ر دفتر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ سے ملسکتی ہے،

قاعدہ تیسیر القرآن، مولوی ابوالفیض محمد سلیمان صاحب بی اے نے ابتدائی قاعدے "قاعدہ بغدادی" میں نہایت حسن وخوبی سے ضروری ترمیم کرکے یہ رسالہ شائع کیا ہے، رسالہ میں ۲۱ اسباق ہیں اور ہر سبق کی ابتدا میں تعلیقاً علیحدہ علیحدہ اصول تعلیم بتائے گئے ہیں، امید ہے کہ غالباً بچوں کے لیے یہ رسالہ مفید ہوگا، حجم چھوٹی تقطیع پر ۴۸ صفحے لکھائی چھپائی بچوں کے پڑھنے کے لائق اور کاغذ متوسط ہے، قیمت ۲ر پتہ:۔ مکتبہ الفیض چوک فرید امرتسر پنجاب،

عام فہم تفسیر پارہ الم، خواجہ حسن نظامی صاحب نے اردو کی متعدد تفسیروں کو پیش نظر رکھ کر عام فہم زبان میں "عام فہم تفسیر" لکھنی شروع کی ہے، اس تفسیر کا پہلا "پارہ الم" شائع ہوا ہے، اس میں ہر آیت کریمہ علیحدہ علیحدہ جلی حروف میں لکھی گئی ہے، اسکے نیچے تحت اللفظ ترجمہ ہے، پھر اس ترجمہ کے مطالب عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہیں، اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ آخر میں "عملیات" کا ایک باب باندھا گیا ہے، اس کے ذیل میں سورہ الحمد اور آیت الم کے متعلق صوفیہ کے چند بتائے ہوئے عمل اور ان کے کرنے کے طریقے لکھے گئے ہیں جو سینہ بسینہ خواجہ صاحب تک بسلسلۂ روایت پہنچے ہیں اور جنھیں خواجہ صاحب نے اپنی کمال فیاضی سے "میں اجازت دیتا ہوں" کے الفاظ کے ساتھ وقف عام کر دیا ہے، ضخامت ۸۰ صفحے لکھائی چھپائی اچھی اور کاغذ متوسط ہے، ہدیہ ۸ر پتہ:۔ حلقہ مشائخ بکڈپو دہلی،

مجلد ہفدہم	ماہ رجب المرجب ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۲۶ء	عدد دوم

مضامین